ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ندائے اعتدال

مارچ ۲۰۱۵ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	اپنے منہ میاں مٹھومت بنیے	مولانا محمد غزالی ندوی	
۲۔	اداریہ	فکری زاویے	مدیر	۳
۳۔	لمحۂ فکریہ	اصلاح معاشرہ اور دین دار طبقہ	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	٦
۴۔	سیرت	نبی کریمؐ کا غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک	ظفر دارک قاسمی	۹
۵۔	اسلامی تعلیمات	اسلام میں رزق حلال کی اہمیت	محمد قمر الزماں ندوی	۱۵
٦۔	// //	رشوت ہمارے سماج کا ایک ناسور	مولانا ندیم احمد انصاری	۲۰
۷۔	// //	تعمیر سیرت میں اچھے ہم نشین کا کردار	حافظ کلیم اللہ عمری	۲٦
۸۔	نقطۂ نظر	سیاست اور ملک کی تعمیر میں علماء کا کردار	مولانا اسرار الحق قاسمی	۳۰
۹۔	// //	عصر حاضر میں تعلیمات نبوی کی معنویت	مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی	۳۳
۱۰۔	تجزیہ	دور حاضر کی چند اصلاحی تحریکیں	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۳٦
۱۱۔	امید کی کرن	شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے	محمد الیاس ندوی بھٹکلی	۴۴
۱۲۔	شخصیات	سردار چلا گیا (سید حامد مرحوم)	پروفیسر ابوسفیان اصلاحی	۵۲
۱۳۔		تعارف وتبصرہ	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	٦۰
۱۴۔	آخری صفحہ	اور انہوں نے اپنی تقریر ختم کر دی	م۔ق۔ن	٦۴

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

ادا ریہ

فکری زاویے

ایک نظر مصر و سعودیہ پر:

عہد حاضر میں پہلی مرتبہ شاید ایسا ہوا کہ ایک مرکزی حیثیت رکھنے والے مسلم ملک کے سربراہ کا انتقال ہوا تو تعزیتی پیغامات کے ساتھ ساتھ ملامتی خطوط ومضامین بھی بڑی کثرت سے نظر آئے، اس صورت حال پر اسی طرح لوگوں کے موقف مختلف نظر آئے جیسے زندگی میں اس کے اقدامات پر لوگوں کی آراء مختلف تھیں، ہمیں اس پر نہ فقہی بحث کرنی ہے اور نہ شرعی حکم لگانا ہے، یہ ضرور عرض کرنا ہے کہ ذرا سی جو صورت حال تبدیل ہوئی تو اس پر خوش گپیاں کرنے اور خوش فہمیوں میں رہنے کی ضرورت نہیں، مالک لوح وقلم سے یہ دعا کرنے کی ضرورت ہے کہ جو مفید اقدامات کیے گئے خدا کرے کہ ان اقدامات کو دوام واستقرار حاصل ہو جائے اور عالم اسلام کا نقشہ تبدیل ہو جائے، ایک کا انتقال ہوا دوسرا تخت نشین ہوا، اس سے فوری طور پر جو صورت حال پیدا ہوئی اس پر اقبال کا یہ مصرع بے ساختہ زبان پر آیا۔

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

ان لوگوں کو خاص طور پر سوچنا چاہیے اور ہوش کے ناخن لینا چاہیے جو یا تو حالات کا تجزیہ نہیں کر پاتے یا ان کی معلومات بالواسطہ ہوتی ہیں یعنی ذرائع ابلاغ سے آنے والی خبروں کو بھی براہ راست نہیں دیکھ سکتے، بس ہر مسئلہ پر بیان داغتے اور مبارکبادیاں دیتے ہیں اور اخبارات میں نام چھپنے کو معراج کمال سمجھتے ہیں، صحیح بات اور صحیح موقف تو کجا! صحیح بات کرنے والے کو بھی مجنون قرار دے دیتے ہیں۔

سعودی فرمانروا کے انتقال پر اسرائیل نے جو انتہائی غم انگیز اور پر اثر تعزیتی بیان جاری کیا تو اس سے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگنی چاہیے کہ اس شخص کے اسرائیل سے تعلقات کتنے گہرے تھے، اسی طرح غاصب وما کر صدر السیسی کا اس موقع پر نہ آنا اور رجب طیب اردوغان کی آمد اور ان کا استقبال فالِ نیک تھا، جاننے والے جانتے ہیں کہ اس وقت صحیح موقف اختیار کرنے اور اعلان حق کرنے میں ترکی کا یہ مرد آہن تنہا ہے، ان دونوں باتوں سے اندازہ ہوا کہ مصر میں جو کچھ ہوا اور سعودیہ کی امداد سے جس طرح اخوانی حکومت کو اکھاڑ پھینکا گیا تھا اس میں اسرائیل کی مکمل مرضی شامل تھی، دوسری بات جو نکل کر آئی وہ یہ کہ اس وقت کی سعودی حکومت پر جو گروپ قابض تھا وہ اسلام دشمن اور اسلام مخالف تھا، موجودہ فرمانروا کے گروپ کے بارے میں فی الوقت کوئی رائے قائم کرنا جلد بازی ہوگی، لیکن جو فوری تبدیلیاں اور شاہی فرامین جاری ہوئے ان سے کہیں نہیں کہیں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس گروپ کے لوگ کم از کم اسلام دشمن تو نہیں ہیں، اطلاعات کے مطابق اس کے رشتے کہیں نہ کہیں اخوان وحماس سے بلاواسطہ یا بالواسطہ ہیں، رجب طیب اردوغان کی آمد اور ان سے اچھی ملاقات بھی اسی کی غماز ہے، خالد التویجری جیسے ناقص اور اسلام دشمن

ذہن کے حامل انسان سے نجات اور السیسی کے تعزیتی دورے میں موجودہ شاہ کا ملاقات سے انکار بھی معنی خیز ہے، گزشتہ حکومت کا سب سے بڑا اسلام دشمن انسان اور گویا پس پردہ بادشاہ خالد التویجری تھا جس کے بارے میں معتبر اطلاعات ہیں کہ اس کو ہوائی اڈے سے گرفتار کرکے نظر بند کیا گیا، باپ کی عظمت پر کلنک سعود الفیصل کو چلتا کیا گیا، پھر اس اقدام پر اللہ کا شکر کیوں نہ ادا کیا جائے کہ سعودیہ کے قومی خزانہ سے اسرائیل کی حفاظت اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے لئے مصر کے سفاک کو دی جانے والی امداد روک دی گئی، جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ کل تک مصر کی نامعقول عدالتیں اخوانی رہنماؤں کو سزائے موت سنا رہی تھیں اور اب خبر آئی کہ ۳۷ اخوانی رہنماؤں کی سزائے موت کا حکم فوری طور پر منسوخ قرار دیا گیا، ساتھ ہی اسرائیل سے بیان جاری ہوا کہ اسلامی گروپوں سے نجات پانے اور لڑنے کے لئے السیسی کی مدد کرنا ضروری ہے، یہ ہے پیسہ کا کھیل جس کو سمجھنے میں بہت سے لوگوں کو دیر لگی، اور بھی تفاصیل ہیں لیکن ان سے قطع نظر یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اگر کسی شخص یا کسی حکومت کی سرزنش ہوتی ہے تو یوں ہی نہیں ہوتی، ایک شخص کے غلط اقدام سے جو اگرچہ عالمی سازش کا ایک مہرا تھا مگر اس کے مہرا بن جانے کے سبب یمن حوثیوں کی گود میں چلا گیا، تیونس کا انقلاب ناکام ہوا، مصر میں ظلم کا گھناؤنا کھیل رچا گیا اور تحریک اسلامی کا خون کیا گیا، اب سوال یہ ہے کہ اخوان وحماس سے مذاکرات کے اعلان کے مطابق سعودی حکومت سے ان کے رشتے استوار ہونے پر کیا وہ لوگ جو اخوانیوں کو گمراہ، احمق، نامعقول قرار دے رہے تھے اور وہ جماعت جو کچھ اور فتوے لگا رہی تھی وہ اپنا موقف تبدیل کرے گی یا پھر موجودہ فرمانروائے مملکت کی تنقید کرے گی؟ اب تک جو بھی اقدامات ہوئے ہیں خواہ کسی سبب سے ہوں لیکن ہمارے لیے خوشی کا باعث ہیں کہ اس سے نہ صرف اسلام پسندوں کی مصیبت میں کمی ہوگی بلکہ محمد عربی ﷺ کی بعثت اور وجود حرمین کے سبب مرکزیت وجامعیت کے حامل ملک حجاز کو اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کرنے میں مدد ملے گی، اللہ اگر ان ہی سے اپنے دین کی خدمت لے لے تو کیا عجب۔

چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی نہیں:

دہلی انتخابات کے نتائج نے جہاں کئی خوش آئند پیغامات دیے وہیں دعوت فکر وعمل بھی دی، اروند کیجروال کی محنت، تگ ودو، جانفشانی اور ہمت وحوصلہ کی جتنی داد دی جائے کم ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ دوسرے اور اصل مرحلہ میں یعنی اقتدار میں آنے کے بعد وہ کس قدر کامیاب ہوں گے اور ان کی حکومت کتنی کامیاب ہوگی، بظاہر مسلمانوں کے لئے ان کے ذہن میں کوئی اچھا گوشہ تو نہیں اس لئے اگر وہ مسلمانوں کے حق میں کوئی کام نہ کریں تو قابل تعجب بھی نہیں! لیکن یہ ان کا کمال ہوگا کہ وہ ان کو نقصان پہنچانے والا بھی کوئی کام نہ کریں اور عصبیت نہ برتیں۔

اس الیکشن نے یہ بات صاف کردی کہ بجز خدائے تعالیٰ انا کسی کی نہیں چلتی، بلا جب آتی ہے تو سب کو لے ڈوبتی ہے، ہوا امیر وغریب اور حاکم ورعایا کے چراغوں میں کوئی فرق نہیں کرتی۔

بلا بلا ہے عزیزو! بلا کسی کی نہیں
چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی نہیں

دہلی میں مسلمانوں نے واقعی اجتماعیت کا ثبوت دیا، تجزیاتی رپورٹ کے مطابق ۷۰٪ سے زائد مسلم ووٹ عام آدمی پارٹی

کو ملا، لیکن غور طلب یہ ہے کہ بی ۔ جے ۔ پی کو شکست ضرور ہوئی اور ۲۰۱۴ء کے عام انتخابات سے جو نشہ چڑھ گیا تھا وہ ضرور اتر گیا، بڑی حد تک انا بھی چکنا چور ہوگئی، لیکن اس کے کیڈر ووٹ میں کمی نہیں آئی، سیٹ کم ہوگئیں لیکن ووٹ فیصد وہی رہا جو گزشتہ الیکشن میں تھا، اس لیے ایک تو کسی خوش فہمی سے دور رہتے ہوئے صورت حال پر مستقل نظر رکھنے اور صحیح فیصلے لینے کی ضرورت ہے، ساتھ ہی یہ سوچنا بھی لازمی ہے کہ ایک آدمی نے محض چند سالوں کی محنت میں گم نامی سے نکل کر ملک کی دو حکمراں جماعتوں اور برسر اقتدار جماعتوں کو شکست دی، کیا یہ کام مسلمان نہیں کر سکتے، کیا یہ قوم بانجھ ہوگئی جو قیادت کو جنم نہیں دے سکتی، یا یہ قوم اب قیادت کے لائق نہیں رہی یا پھر قائدین کی بھیڑ نے اس قوم کے مستقبل کو ہی ہمیشہ کے لئے مہر بند کر دیا ہے، آخر کب تک دوسروں کی خوشی پر ہی تالی بجائی جائے، ہر طرح کی مثالیں سامنے آچکی ہیں، ہندوازم ذات پات کی بدترین تفریق کے بعد بھی ایک عورت ہزاروں برہمنوں کو نیچے بیٹھنے پر مجبور کرتی ہے، ایک آدمی گوشۂ گمنامی سے نکل کر آتا ہے اور بلاتفریق مذہب سب کے دل جیت کر اقتدار تک پہنچ جاتا ہے، لیکن ہماری قوم بس تجزیے، تبصرے اور تالیوں، بیان بازیوں کو ہی اپنا مقدر سمجھتی ہے، افسوس ہے کہ جن کے پاس فکر ہے وہ عدم وسائل کے سبب عوام تک بات نہیں پہنچا سکتے محض کسی چہار دیواری میں کڑھنے پر مجبور ہیں، اور جن کے پیچھے عوام کا جم غفیر اور سامنے وسائل کا انبار ہے وہ گویا فکروں سے دستبردار ہیں یا کسی طرح کی محنت و مغزماری کو مفید نہیں سمجھتے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اب آئندہ الیکشن یوپی کا ہے، اور بی جے پی کی اصل توجہ کا مرکز یوپی و بہار ہی ہے، بہار میں تو بظاہر وہ کچھ کامیاب ہوتی نظر آرہی ہے، جس طرح وہاں اس نے اضطراری کیفیت پیدا کی اور بات جوڑ توڑ کے مرحلہ تک پہنچی اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے تیور ٹھیک نہیں اگرچہ اس وقت مکمل کامیابی نہیں ملی لیکن مستقبل میں کچھ بھی امکان ہے، یوپی میں آئندہ ہمارا طرز فکر و عمل طے کرے گا، علماء کونسل اور پیس پارٹی کیا کم تھی، اب MIM بھی اتر پردیش کا رخ کر رہی ہے، ہم اس کو دیگر مسلم جماعتوں کے بالمقابل زیادہ کامیاب اور تجربہ کار سمجھتے ہیں لیکن یوپی کے منظر نامہ میں اس کی کامیابی کا امکان نہ کے برابر ہے، پھر دہلی میں ''عاپ'' کامیاب ہو کر جب یوپی کا رخ کرے گی تو اپنا اثر کچھ نہ کچھ ضرور دکھائے گی، اس صورت حال میں سب سے زیادہ منتشر ہم ہوں گے، اور ہمارے انتشار کا راست فائدہ بی جے پی کو ہوگا جبکہ اتحاد کی صورت میں اپنی قیادت کو بھی جنم دیا سکتا ہے اور دوسری جماعتوں سے اتحاد بھی ممکن ہے لیکن یہ فیصلہ تو قائدین ملت اور دانشور حضرات کریں گے کہ وہ قوم کو کدھر لے جانا چاہتے ہیں، ان کے ہی اتحاد میں ملت کے سیاسی وجود کا راز مضمر ہے، سب متحد ہو کر اپنی قیادت کو بھی جنم دے سکتے ہیں یا سب مسلم پارٹیوں کو ملا کر کسی بڑی پارٹی سے سیاسی اتحاد کر سکتے ہیں، دونوں طرح بڑے فائدے کا امکان ہے لیکن بنیاد قائدین و ارباب دانش کے اتحاد پر ہی ہوگی، اب یہ حضرات کس حد تک متحد ہو سکیں گے یہ ایک اہم سوال ہے؟؟؟ قدیم تر سیاسی و نیم سیاسی تنظیمیں اور ان کا حال بھی سامنے ہے، اتحاد کے تلخ تجربات اور اپنوں کی کج فہمی، مفاد پرستی اور بے رخی بھی سامنے ہے اور خوفناک مستقبل بھی دستک دے رہا ہے، واللہ المستعان۔ ☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

لمحۂ فکریہ

اصلاح معاشرہ اور دین دار طبقہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

یہ کیسی ذہنیت ہے کہ کبھی اسلام کی دُہائی دی جائے اور اس کے گن گائے جائیں اور کبھی اس کی تعلیمات سے چشم پوشی اختیار کی جائے اور مطالبات شریعت کو یکسر مسترد کر دیا جائے، عزیز و اقارب اور بگڑے ہوئے انسانی معاشرے کے تقاضوں کو سنت نبوی پر ترجیح دی جائے، یہی نہیں بلکہ خود ساختہ رسومات و خرافات اور بدعات کو معاشرتی مجبوری قرار دے کر شریعت محمدی کا جنازہ نکالا جائے اور ساتھ ہی دین کی ٹھیکیداری کا بھی اعلان کیا جائے، یہ بڑی خطرناک ذہنیت ہے اور بڑی بھیانک تصویر ہے ان لوگوں کی جو باغیرت و باعزت مسلمان ہونے اور دیندار ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور جب جی چاہتا ہے تو من چاہے طریقوں کو اختیار کر کے اسلام کی واضح تعلیمات کو بھلا کر اپنی انا کو تسکین دیتے ہیں، بالخصوص شادیوں کے موقع پر یہ ذہنیت خوب کام کرتی ہے، اس موقع پر تو اچھے خاصے صاحب فکر دیندار اور مذہب کے جانکار لوگ بھی اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کو تشدد سے تعبیر کرتے ہیں، اور جو اس کی جانب اشارہ کرے اسے متشدد اور انسانی معاشرے کے تقاضوں سے بے خبر قرار دے کر متمدن سوسائٹی سے الگ کر دیتے ہیں

حیرت و افسوس کی بات یہ ہے کہ جہیز و بارات اور دعوتوں کی فضول خرچیوں اور اسراف میں اچھے اچھے اصحاب جبہ و دستار اور اصلاحِ معاشرہ کی تحریک کے قافلہ سالار بھی پیچھے نہیں رہتے، دعوتوں میں بھیڑ اکٹھا کرنا، اصحاب ثروت و اصحاب مناصب کو جمع کرنے کی ہوڑ میں لگ جانا، محض ایک شادی میں شرکت کے لئے دور دراز سے سفر کر کے جانا اور اس قدر تنوع اختیار کرنا جس پر اسراف و فضول خرچی کا شائبہ ہونے لگے، اس سے شاید کچھ لوگ ہی محفوظ ہیں، ورنہ سادگی و سنت کے اتباع کی تلقین تو دوسروں کو ہے، تحریک اصلاح معاشرہ کی ہے اصلاحِ ذات یا اصلاحِ نفس کی نہیں، ابھی حال ہی میں ایک مولوی صاحب کی ذہنیت معلوم ہوئی تو بڑا تعجب ہوا کہ جہیز (اور اس میں بھی دی جانے والی ایک ایسی چیز جو نہ جانے کتنی بیٹیوں کے قتل کا سبب بن چکی ہے اور ایک بڑی تعداد کو باپ کے گھر بیٹھی رہنے پر مجبور کیا ہے) کے سلسلہ میں ان سے دریافت کیا گیا کہ ہمارے منع کرنے کے باوجود بھی ہمیں یہ چیز دی جا رہی ہے تو مولوی صاحب نے فرمایا، ٹھکرانے کے بعد آئے تو اسے نعمتِ خداوندی سمجھ کر لے لینا چاہیے ورنہ اب نہ لینا نعمت کی ناقدری ہوگی۔ ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

شادی کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کا واضح ارشاد ہے جسے بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے ’’ان اعظم النکاح ایسرہ مؤنۃ ‘‘ جس نکاح میں کم ترین خرچ ہے وہ برکت میں اسی قدر بڑھا ہوا ہے ، اندازہ کیجئے اس حدیث رسول کی روشنی میں معاشرے میں پائے جانے والے اضطراب کا ، خاندانی اور گھریلو مسائل کا ، ازدواجی زندگی کی بے چینیوں کا ، لڑکا تو لڑکا ہے کہ اس کا ولیمہ سنت ہے ، لیکن لڑکی کی شادی میں ہونے والی دعوتیں ! کس طرح ان کے جواز کا پہلو نکالا جائے جبکہ ذخیرہ روایات میں اس کی کوئی دلیل نہیں ، جن لوگوں کو بھی ہم اپنا پیشوا اور مقتدی تسلیم کریں ان کے یہاں کوئی مثال نہیں وہ سب کے سب شادی شدہ ان کی سب اولادیں بھی بیاہی کیا کہیں کوئی مثال ملتی ہے ؟ پھر دھوم دھام کی بارات دیکھئے ، کیا اس کا جواز ملتا ہے ، اس سے آگے چلیے تو کیا دیگر رسومات اور عورتوں کی بھیڑ میں دولہے میاں کا گھر میں تشریف لے جانا کیا یہ سب اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں ، یا پھر یہاں پہنچ کر دینداری کا پاس ولحاظ نہیں رہتا یا دین کے معنیٰ بدل جاتے ہیں ، دین تو کامل ومکمل ہے اس میں انسانی اور فطری تقاضوں کی بھرپور رعایت کے ساتھ لغو اور بے کار چیزوں کی کوئی گنجائش نہیں ۔

لڑکے کا ولیمہ سنت ہے لیکن استطاعت کے بقدر ، ایسا نہ ہو کہ اس طرح کا قرض لیا جائے جو بوجھ بن جائے یا سودی قرض ہو ، بارات کا تو جواز ہی نہیں ، ہاں اگر کچھ لوگوں کی لڑکی والے رخصتی کے موقع پر تواضع کریں تو یہ ان کی صوابدید پر ہے ورنہ بارات کی رائج شکل اور لڑکی کا ولیمہ خالص ہندوستانی رسم ہے اس کا مذہب اسلام سے اور اسلاف کی زندگی سے کوئی رشتہ نہیں ، اسلام کی زریں تعلیمات میں اس کی کوئی مثال نہیں ، رہی بات جہیز کی تو یہ معاشرے کی وہ لعنت ہے جس نے ہزاروں غریب بیٹیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور والدین کو ان کے غم میں گھلا کر یہ احساس دلایا کہ ان کی زندگی عذاب ہے ، ہندوستانی معاشرے کی اس لعنت نے جسے صاحب حیثیت لوگوں نے جنم دیا اسلامی قانون وراثت کو پامال کرتے ہوئے لڑکیوں کی شادی کو مسئلہ بنا دیا اور ایک بڑی تعداد کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے جبکہ ایک بڑی تعداد کو شادی سے ہی محروم رکھا ، ہے کوئی صاحب غیرت جو یہ اعلان کرے کہ میں جہیز نہیں دوں گا کہ یہ غیر اسلامی رسم ہے لیکن میں لڑکی کو وراثت میں حصہ دوں گا کہ شریعت محمدی کی رو سے وہ اس کا قانونی حق ہے ، جب ان تین بڑی رسموں یعنی جہیز ، بارات اور لڑکی کے ولیمہ کا یہ حال ہے کہ ان کا دین محمدی سے کوئی رشتہ نہیں تو پھر دیگر رسموں کی بابت کیا لکھوں کہ وہ خرافات ، بدعات اور ہندوستانی معاشرے کی بدترین پیداوار کے سوا کچھ بھی نہیں ، مہینوں شادی کی تیاریاں اور اس کا جشن ، دھوم دھام کی دعوتیں ، سینکڑوں کلو میٹر کا سفر محض شادیوں میں شرکت کے لیے کرنا ، دور دراز کے علاقوں کا سفر کر کے نیوتہ بھیجنا اور نیوتہ کی رقم کو جبری فرض سمجھنا اور جانے کیا کیا کرنا ، یہ سب اسلامی زندگی کا حصہ نہیں اور اسلاف کی زندگی میں اس کی کوئی دلیل نہیں ، مہر جو شادی کا اہم رکن ہے اس میں ہندوستانیت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اور اسلامیت کو پس پشت ڈالا جاتا ہے ، مہر اس بڑی رقم کی شکل میں متعین کی جاتی ہے کہ اس کے اعلان سے دولہے میاں کی شان تو بڑھ جاتی ہے لیکن تا زندگی وہ مہر ادا نہیں کر پاتے بلکہ پہلے ہی موقع پر ہاتھ جوڑنا ان کا مقدر ہوتا ہے ، یہ کسی طور پر بھی

درست نہیں اس لیے مہر ایسا ہونا چاہیے جو فوری طور پر ادا کی جاسکے یہی مطلوب و مستحسن ہے۔

اگر اسلامی طریقہ پر شادیاں ہونے لگیں تو یقیناً زندگیاں بڑی خوشگوار ہوجائیں اور بڑی حد تک معاشرتی اور گھریلو زندگی میں پائے جانے والا اضطراب ختم ہوجائے، جب اس بابرکت عبادت کی بنیاد ہی غیر اسلامی طریقہ پر ہو تو پھر اس کے مستقبل کا اللہ محافظ، تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ اچھے اچھے اصلاح معاشرہ کے علمبردار اور اصلاح عوام کی فکر کرنے والے اپنے آپ کو دانشور اور صاحب فکر کہنے والے بھی ان موقعوں پر فساد زدہ معاشرے کے خلاف آواز نہیں اٹھا پاتے، حالانکہ معاشرے کے خلاف بغاوت کرنے اور رسم ورواج کو مٹانے کیلئے صرف جذبہ ایمانی، دینی غیرت وحمیت اور پختہ ارادے کی ضرورت ہے، اسلامی تعلیمات کے مطابق شادی کوئی قصۂ پارینہ اور ماضی کی داستان نہیں، اس دور مادیت میں بھی اس کی روشن مثالیں ملتی ہیں، ہم نے سعید بن المسیبؒ جیسے بزرگ کے بارے میں پڑھا تھا کہ لڑکی کا نکاح کیا اور خود اسے لیکر اس کے شوہر کے گھر پہنچا دیا، اس مادی دور میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں، ایسے باہمت لوگ موجود ہیں جو یہ کام کرتے ہیں، تحدیث نعمت کے طور پر ذکر کرنے میں حرج نہیں کہ توفیق الٰہی سے ہم نے خود حتی الامکان بالخصوص شادی، بیاہ میں اسلامی تعلیمات کو ہی اپنانے کی کوشش کی ہے۔

کام کوئی مشکل نہیں، ضرورت عزم و ارادے اور دینی غیرت وحمیت کی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ذہنیت کو بدلا جائے جو اس طرح کے موقعوں پر دین کو بدل دینا چاہتی ہے اور خلافِ شریعت امور پر نکیر کو شدت پسندی قرار دیتی ہے، ضرورت ہے کہ ایسے لوگوں کے خلاف بغاوت کی جائے جو رشتہ داری پر دینداری کو ترجیح نہیں دیتے بلکہ مال ودولت اور نام ونمود کے قائل ہیں، ایسے لوگوں کے خلاف زبردست احتجاج کیا جائے جو شادیوں کو ایک مسئلہ بنادینے پر آمادہ ہیں، جو لڑکی کی شادی میں دعوت اور بارات کی ضیافت اور جہیز کو درست سمجھتے ہیں، اپنے معاشرے کے خلاف ہی نہیں بلکہ خود اپنے خلاف بغاوت واحتجاج کی ضرورت ہے، اگر اس پر ڈٹ جائیں اور اپنے خلاف احتجاج اور اپنے احتساب پر راضی ہوجائیں تو پھر ہماری زندگیاں بھی خوشگوار اور ہمارا معاشرہ بھی پرامن ہوجائے گا، لوگ نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہیں گے طعن وتشنیع کرتے رہیں گے، لیکن ہمارا کچھ نہ بگڑ سکے گا'' و

ان تصبروا و تتقوا لا یضرکم کیدھم شیئا

''اے مسلمانو! اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو یعنی اللہ سے ڈرو تو ان دشمنوں کی کوئی سازش تم کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ حضرات علماء جن **کی اکثریت بھی دعوتوں اور شادیوں کے سلسلہ میں بہت کچھ وہی کر گزرتی ہے جو عوام کرتے ہیں، وہ اپنے آپ کو بدلیں اپنے بچوں کے نکاح میں صحابہ کی سی سادگی کی مثال پیش کریں اور پھر اس طرح کی شادیوں کا بائیکاٹ کریں، جو سراسر خلاف شریعت امور سے بھری ہوئی ہوں، اگر یہ حضرات عملی طور پر کثرت سے اس کے نمونے پیش کرنے لگیں تو شادیاں آسان ہوجائیں گی اور گناہ کم ہوجائیں گے، خصوصاً دعوتوں کی فضول خرچی، دور دور سے صرف شادی میں شرکت کے لئے اہتمام، بارات اور جہیز کے لین دین پر نکیر کرنے کے لئے عملی اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔**

☆☆☆

گوشۂ سیرت

نبی کریم ﷺ کا غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک

ظفر دارک قاسمی
سکریٹری: اقرأ ایجوکیشنل اینڈ ویلفئر سوسائٹی، انڈیا

نبی کریم ﷺ کی سیرت تمام عالم کے لیے نمونہ اور قابل تقلید ہے جس سے دنیا کا کوئی بھی فرد با آسانی رہنمائی حاصل کر سکتا ہے، آپ ﷺ نے انسانیت کی بنیاد پر غیر مسلموں کے ساتھ بھی مشفقانہ سلوک کا مظاہرہ کیا اور ہمیں بھی اس کا درس دیا، قرآن میں مذکور ہے کہ ''یقیناً تمہارے لیے رسول ﷺ میں عمدہ نمونہ ہے ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے اور وہ بکثرت اللہ کی یاد کرتا ہے''۔ (احزاب:۲۱)

محمد ﷺ نے جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی انسانیت کو فلاح کی راہ دکھائی اور آپ نے جو معاشرتی نظام پیش کیا اس میں نہ صرف مسلمانوں کو آپس میں حسن سلوک سے پیش آنے کی تلقین کی بلکہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن معاشرت کی تعلیم دی۔ اور اس کا خود بھی عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔ غیر مسلم چاہے مہمان ہو یا پھر ہمسایہ اور مسلم ریاست کا شہری ہو ہر صورت میں رسول ﷺ نے اس سے نیک برتاؤ، روادارانہ رویہ اپنانے کی تلقین و تعلیم دی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی جان و مال اور آبرو کا تحفظ مسلم حکومت اور معاشرے کی اہم ترین ذمہ داری قرار دی ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۔ (سورہ الانبیاء :108) کہ اے نبیؐ ہم نے تجھے تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اور اس حسن کے پیکر نے اپنے عملی نمونہ سے خود کو رحمۃ للعالمین ثابت بھی کیا۔ چنانچہ آپ ﷺ لوگوں کے ایمان نہ لانے کی حالت میں دکھ، کرب اور درد محسوس کرتے تھے، اسی پر بس نہیں بلکہ یہ فکر اس قدر ستانے لگی تھی کہ محمد ﷺ ان کے ایمان نہ لانے کی صورت میں اپنی جان کو تلف نہ کر دیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ قوم کے ہر فرد کے خیر خواہ اور ہمدرد تھے، بہر صورت انہیں دنیا اور آخرت میں محفوظ و مامون دیکھنا چاہتے تھے۔ قرآن میں مذکور ہے۔ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِيۡثِ اَسَفًا (سورہ الکھف: 7) ''پس کیا تو شدتِ غم کے باعث ان کے پیچھے اپنی جان کو ہلاک کر دے گا اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائیں''

اسی طرح ایک دوسری جگہ فرمایا: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ اَلَّا يَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ (سورۃ الشعراء:4) ''کہ کیا تو اپنی جان کو اس لئے ہلاک کر دے گا کہ وہ مومن نہیں ہوتے''

یہود کی بدسلوکی

غیر مسلم مکہ میں مسلمانوں کو اپنے آزار اور ظلم وستم کا نشانہ بناتے رہے انھوں نے محمد ﷺ اور ان کے صحابہ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں مگر آپ نے صبر وسکون اور حسن اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ اور مدینہ میں اسلام اور محمد ﷺ کے خلاف یہود و نصاریٰ کی سازشیں اور اسلام کو داغ دار کرنے کی ناپاک کوششیں اسلام کے پیغام امن کو رتی برابر زد نہ پہنچاسکیں۔ آپ نے دشمنوں کی بدسلوکی اور بدتمیزی کو اپنے حسن اخلاق سے ماند کردیا۔ ماخذ بیان کرتے ہیں۔

عَن عَبدِاللهِ بنِ عَمرٍو رَضِیَ االلهُ عَنهُمَا اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ النَّبِیَّ: اَیّ الاِسلَامِ خَیر؟ قَالَ: تُطعِمُ الطَّعَامَ، وَ تَقرَءُ السَّلَامَ عَلٰی مَن عَرَفتَ وَ مَن لَم تَعرِف۔ (صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب اطعام الطعام من الاسلام)

''حضرت عبداللہ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریمؐ سے پوچھا کہ کون سا اسلام بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا تم کھانا کھلایا کرو اور ہر کسی کو سلام کیا کرو خواہ تم اسے جانتے ہو یا نہیں جانتے''۔

یہود آنحضور کی مخالفت میں بہت بڑھے ہوئے تھے اور اپنے شاطر دماغوں سے کوئی نہ کوئی طریقہ آپ یا مسلمانوں کو تکلیف دینے کا ڈھونڈتے رہتے تھے۔ لیکن آنحضور نے ہمیشہ ان کو نرمی سے جواب دیا اور اپنے اصحاب کو بھی نرمی کی تلقین فرمائی۔

ماخذ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ایک یہودی گروہ آنحضور کی خدمت میں آیا اور انہوں نے شرارتاً اَلسَّلَامُ عَلَیکُم کی بجائے اَلسَّامُ عَلَیکُم "یعنی تم پر ہلاکت ہو" کہا مجھے سمجھ لگ گئی میں نے انہیں کہا کہ ہلاکت تم پر ہو اور انہیں ملامت کی لیکن رسول اللہ نے مجھے فرمایا کہ عائشہ ٹھہرو "اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الرِّفقَ فِی الاَمرِ کُلِّه" کہ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ میں نرمی پسند کرتا ہے۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول کیا آپ نے سنا نہیں کہ انہوں نے کیا کہا تھا؟ آپ نے فرمایا میں نے انہیں جواب میں کہہ دیا تھا کہ "وَعَلَیکُم" یعنی تم پر بھی۔ (صحیح البخاری، کتاب الادب، باب الرفق فی الامر کلہ)

معاشرتی تعلقات

محمد ﷺ تمام نوع انسانیت کے ساتھ مساوات، عدل وانصاف، حسن اخلاق کا معاملہ فرماتے تھے۔ اور مسلم غیر مسلم سبھی کی خوشی، غم میں شریک ہوتے تھے۔ اگر معاشرے یا سماج میں کوئی شخص بیمار پڑتا تو اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے اور اس کے لیے مناسب دعا فرمایا کرتے تھے۔ ماخذ بتاتے ہیں "اَنَّ غُلَامًا لِیَهُودَ، کَانَ یَخدُمُ النَّبِیَّ، فَمَرِضَ فَاَتَاهُ النَّبِیُّ یَعُودُهُ"۔ (صحیح البخاری، کتاب المرض، باب عیاد المشرک) ''رسول کریم کا ایک خادم یہودی تھا بیمار ہوگیا۔ رسول کریم اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے''۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے وہیں غیر مسلموں کے ساتھ بھی ہمدردی، غم گساری کا رویہ اپناتے تھے۔ آپ ہمیشہ قوم کی باہم اتفاق، رواداری کی طرف رہنمائی فرماتے تھے۔ ماخذ میں مذکور ہے۔

عَن اَبِی هُرَیرَةَ رَسُولَ اللهِ ضَافَهُ ضَیف کَافِر، فَاَمَرَلَهُ رَسُولُ اللهِ بِشَاةٍ فَحُلِبَت فَشَرِبَ، ثُمَّ اُخرَی فَشَرِبَهُ، ثُمَّ اُخرَی فَشَرِبَهُ حَتّٰی شَرِبَ حِلَابَ سَبعِ شِیَاهٍ، ثُمَّ صَبَحَ

مِنَ الغَدِ فَسلَمَ،فَأمَرَ لَهُ رَسُولُ اللهِ بِشَاۃٍ فَحُلِبَت فَشَرِبَ حِلَابَھَا،ثُمّ أمَرَلہ بِأخری فَلَم یَستَتِمّھَا۔ (سنن الترمذی ،کتاب الاطعمہ،باب ماجاء ان المؤمن یاکل فی معی واحد)

''حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم نے ایک کافر کی مہمان نوازی کی۔ نبی کریم نے اس کے لئے ایک بکری منگوائی اور اس کا دودھ دوہا گیا۔ وہ اس کا دودھ پی گیا۔ پھر ایک دوسری منگوائی گئی اور اس کا دودھ دوہا گیا تو اس نے اس کا دودھ بھی پی لیا۔ پھر ایک تیسری بکری منگوائی گئی تو وہ اس کا دودھ بھی پی گیا۔ حتیٰ کہ وہ سات بکریوں کا دودھ پی گیا۔ اگلے دن صبح کے وقت اس نے اسلام قبول کرلیا۔ پھر رسول کریم نے بکری منگوائی اور اس کا دودھ دوہا گیا۔ پس اس نے دودھ پی لیا پھر نبی کریم نے اس کے لئے ایک اور بکری منگوائی مگر وہ اس کا دودھ مکمل طور پر نہ پی سکا''۔

یہ مثالیں اس بات پر شاہد ناطق ہیں کہ اسلام کی تعلیمات معاشرتی پہلو پر ہندو مسلم فرق کے بغیر رہنمائی کرتی ہیں تاکہ معاشرے میں امن وسکون قائم رہے۔ لوگ باہم ہمدرد، معاون بن سکیں کیونکہ اسی وقت معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکےگا اور سماج کی جملہ برائیوں، بدعنوانیوں کا قلعہ قمع ہوگا۔

دوران جنگ حسن سلوک

حضورﷺ نے غیر مسلموں سے حسن سلوک، رواداری اور ان کے حقوق کا تحفظ صرف عام حالات میں ہی نہیں کیا بلکہ جنگ کی حالت میں بھی اس کا عملی نمونہ پیش کرکے دکھایا جس میں آج بھی قومیں ہر طرح کی فریب دہی جائز سمجھتی ہیں اور کوئی موقع ہاتھ سے دشمن کو پسپا کرنے کا نہیں جانے دیتیں، اس جنگی حالت میں بھی حضور نے حسن سلوک کی ایسی اعلیٰ مثالیں قائم کیں کہ انسانی عقل جنہیں دیکھ کے دنگ رہ جاتی ہے چنانچہ جنگ بدر کے موقع پر جب مسلمانوں نے پانی کے چشمہ پر حوض بنا کے وہاں پڑاؤ ڈال لیا تو باوجود حالت جنگ کے جب دشمن پانی لینے آیا تو آپ نے فرمایا انہیں پانی لے لینے دو۔ (السیرۃ النبویہ، لابن ہشام صفحہ 424 ذکر رؤیا عاتکہ بنت عبدالمطلب)

اسی طرح حالت جنگ میں فرمایا کہ کسی غیر مسلم کی لاش کا مثلہ نہ کیا جائے، اسے باندھ کر نہ مارا جائے، اسے جلایا نہ جائے وغیرہ وغیرہ یعنی اس کے ساتھ کوئی ایسی زیادتی نہ کی جائے جو انسانیت سے ہٹی ہوئی ہو۔ وَلَا تَمثلوا: ''مثلہ نہ کرو'' جب کہ عربوں میں مثلہ کی رسم عام تھی۔ یعنی جنگ میں دشمن کی لاشوں کے ناک کان وغیرہ کاٹ کر ان کا منہ بگاڑ دینا۔ لیکن آپ نے بڑی تاکیدی ہدایت اپنے پیروؤں کو دی کہ وَلَا تَمثُلُوا کہ تم مثلہ نہ کرو۔ اور اس طرح غیر مسلموں کے مُردوں کا بھی احترام برقرار رکھا۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب الجھاد، باب وصیۃ الامام)

غیر مسلموں سے رواداری

یہی وجہ ہے کہ غیر مسلموں نے بھی آپﷺ کو غلبہ کی دعا تک دی ہے۔ ماخذ بیان کرتے ہیں جب شام فتح ہوا تو مسلمانوں نے شام کے لوگوں سے جو عیسائی تھے ٹیکس وصول کیا لیکن اس کے تھوڑے عرصے بعد رومی سلطنت کی طرف سے پھر جنگ کا اندیشہ پیدا ہوگیا جس پر شام کے اسلامی امیر حضرت ابوعبیدہ نے تمام وصول شدہ ٹیکس عیسائی آبادی کو واپس کردیا اور کہا کہ جنگ کی وجہ سے جب ہم تمہارے حقوق ادا نہیں کرسکتے تو ہمارے لئے جائز نہیں کہ یہ ٹیکس اپنے پاس

رکھیں۔عیسائیوں نے یہ دیکھ کر بے اختیار مسلمانوں کو دعا دی اور کہا خدا کرے تم رومیوں پر فتح پاؤ اور پھر اس ملک کے حاکم بنو۔(ابو یوسف، کتاب الخراج ،صفحہ 80 تا 82)

جب حضور نے خیبر فتح کیا تو یہود خیبر کی درخواست پر انہیں کاشتکاری کی اجازت دی۔جب فصل کٹنے کا وقت آیا تو حضور نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو وصولی کے لیے بھیجا تو آپ نے اس وقت کی فصل جو کہ کھجوریں تھیں دو حصوں میں برابر تقسیم فرمائیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ آپ نے ہمیں ہمارے حصہ سے زیادہ تقسیم فرمارہے ہیں کیوں کہ ان کے اپنے اصول کے مطابق ان کا حصہ آدھا نہیں بنتا تھا لیکن حضرت عبداللہ بن رواحہ نے فرمایا تمہیں ضرور آدھی ہی ملیں گی کیوں کہ تم سے معاہدہ اسی طرح ہوا تھا۔اس پر وہ بے اختیار بول اٹھے کہ ھٰذَا الحَقّ وَبِہ تَقُومُ السَّمَاءُ وَالارضُ'' کہ یہی حق ہے اور اسی سے آسمان و زمین قائم ہیں''۔(سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی المساقاۃ)

غیر مسلموں کو دعا

حضور کا غیر مسلموں کے لیے دعائیں کرنا ثابت کرتا ہے کہ آپ کو ان سے سچی ہمدردی تھی اور آپ کی حد درجہ خواہش تھی کہ خدا کا پیغام وہ سنیں اور اس کے احکام وہ مانیں۔اس لیے مسلسل ان کے لیے دعائیں آپ کیا کرتے تھے اور بخشش مانگا کرتے تھے۔ماخذ بیان کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ میں اپنی مشرک والدہ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ایک دن میں نے انہیں تبلیغ کی تو انہوں نے رسول اللہ کے بارہ میں ناپسندیدہ باتیں کیں۔میں رسول کریم کے پاس روتا ہوا حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ ! میں اپنی والدہ کو اسلام کی دعوت دیتا تھا تو وہ انکار کرتی تھیں۔آج میں نے دعوت دی تو انہوں نے آپ کے متعلق نازیبا باتیں کیں جنہیں میں ناپسند کرتا ہوں۔آپ اللہ سے دعا کریں کہ وہ میری والدہ کو ہدایت دے۔رسول کریم نے دعا کی کہ اے اللہ! ابو ہریرہ کی والدہ کو ہدایت دے۔میں رسول کریم کی دعا سے خوش خوش واپس ہوا۔جب میں گھر کے دروازہ کے پاس آیا تو وہ بند تھا۔میری والدہ نے میرے قدموں کی آواز سنی تو کہا اے ابو ہریرہ ادھر ہی ٹھہر جاؤ۔ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے پانی کے گرنے کی آواز سنی۔ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ انہوں نے غسل کیا اور کپڑے زیب تن کیے۔دوپٹہ اوڑھا اور دروازہ کھول دیا۔پھر انہوں نے کہا اے ابو ہریرہ میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتی ہوں کہ محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔(صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی ھریر رضی اللہ عنہ)

اسی طرح ماخذ میں یہ بھی مذکور ہے کہ طفیل بن عمرو الدوسی اور ان کے ساتھی نبی کریم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی۔یارسول اللہ! دوس قبیلے نے اسلام کی دعوت کا انکار کر دیا ہے۔اس لئے آپ ان کے خلاف بد دعا کریں۔کسی نے کہا کہ اب تو دوس قبیلہ ہلاک ہو گیا۔نبی کریم نے اس طرح دعا کی کہ اے اللہ! تو دوس قبیلے کو ہدایت دے۔(صحیح البخاری ،کتاب الجھاد والسیر ،باب الدعا للمشرکین ،بالھزیم وزلزل)

حضرت جابر سے مروی ہے کہ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! ہمیں ثقیب کے تیروں نے چھلنی کر چھوڑا ہے۔اس لئے آپ ان کے خلاف بد دعا کریں۔آپ نے اس طرح دعا فرمائی:۔

اَللّٰھُمّ اھدِ ثَقِیفًا ’’کہ اے اللہ تو ثقیف قبیلہ کو ہدایت دے‘‘۔(سنن ترمذی، کتاب المناقب ،باب مناقب فی ثقیف وبنی حنیف)

ماخذ بتاتے ہیں کہ محمدﷺ کی رواداری کی ایک بہترین مثال یہ ہے کہ آپ نے غیر مسلموں کے حق میں بارش کی دعا فرمائی۔حضرت عبداللہ ابن مسعود سے مروی ہے کہ جب قریش نے اسلام کی مخالفت کی اور اس کو قبول کرنے میں تاخیر سے کام لیا تو اس وقت آنحضور نے ان کے خلاف بددعا کی۔چنانچہ اس کے نتیجے میں ان کو قحط کا سامنا کرنا پڑا۔اور وہ بھوک کی وجہ سے مرنے لگ گئے اور مردار اور ہڈیاں کھانے تک نوبت آ گئی۔ اس پر ابوسفیان آنحضور کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور کہا اے محمد! آپ صلہ رحمی کرنے کا حکم لے کر آئے ہیں۔آپ کی قوم ہلاک ہورہی ہے۔ ان کے واسطے اپنے مولا سے دعا کریں۔اس پر آنحضور نے دعا کی اور مسلسل سات دنوں تک ابررحمت ان پر اس قدر برسا کہ لوگوں نے بارش کی زیادتی کی وجہ سے تکلیف سے آپ کو آگاہ کیا اس پر آپ نے یہ دعا کی ’’اَللّٰھُمّ حَوالَینا وَلَاعَلَینا ۔‘‘کہ اے خدا! ہمارے اردگرد برسا اور ہم پر نہ برسا۔‘‘ اس پر بادل آپ کے سر سے چھٹ گئے اور اردگرد کے علاقوں کو سیراب کرنے لگے۔(صحیح البخاری، کتاب الاستسقاء، باب اذا استشفع المشرکون بالمسلمین)

آگے ماخذ کا یہ بھی بیان ہے: حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول کریم سے پوچھا کہ کیا آپ پر احد کے دن سے بھی زیادہ کوئی سخت دن آیا ہے؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ مجھے جو تمہاری قوم کی طرف سے پہنچا وہ تو پہنچا ہی لیکن ان کی جانب سے سب سے تکلیف دہ عَرَفہ کا دن تھا جب میں ابن عبد یالیل بن عبد کلال کے پاس گیا۔جس چیز کا میں نے ارادہ کیا ہوا تھا اس کا انہوں نے جواب نہ دیا۔میں واپس اس حال میں لوٹا کہ میرے چہرے پر غم کے آثار تھے۔میں مسلسل چلتا رہا یہاں تک کہ قرن الثعالب مقام پر آ پہنچا۔آپ فرماتے ہیں کہ اس جگہ آ کر میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بادل کے ٹکڑے نے مجھ پر سایہ کیا ہوا ہے۔اور اس میں جبرئیل ہے۔ جبرئیل نے مجھے پکارا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے بارے میں قوم کی باتیں سن لیں اور ان کا ردعمل دیکھ لیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے کہ آپ ان (طائف والوں) کے بارہ میں جو چاہیں اس کو حکم دیں۔ چنانچہ پہاڑوں کے فرشتے نے مجھے پکارا، مجھ پر سلامتی بھیجی اور عرض کی کہ آپ حکم فرمائیں۔وہی ہوگا جو آپ چاہیں گے۔اگر آپ چاہیں تو میں ان پر دونوں پہاڑ گرادوں۔اس پر رسول کریم نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اولاد میں سے ایسے لوگ پیدا کردے گا جو کہ خدائے واحد کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔(صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب اذا قال احدکم آمین والملائکہ)

حضرت انس بن حارث سے مروی ہے کہ ایک یہودی عورت نے نبی کریم کو بکری کا گوشت دیا جس میں زہر ملا ہوا تھا۔آپ نے اس میں سے کچھ کھایا جب اس عورت کو حضور کے پاس لایا گیا تو صحابہ نے عرض کیا کیا ہم اسے قتل نہ کردیں؟ فرمایا کہ نہیں۔حضرت انس کہتے ہیں کہ آپ کے تالو میں اس زہر کا اثر ہمیشہ باقی رہا۔(صحیح البخاری، کتاب الھبۃ وفضلھا، باب قبول الھدیۃ من المشرکین)

غیر مسلموں کے جنازہ کا احترام

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ بیان کرتے ہیں کہ سھل بن حُنیف اور قیس بن سعد قادسیہ کے مقام پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو وہ دونوں کھڑے ہوگئے جب ان کو بتایا گیا کہ یہ ذمیوں میں سے ہے تو ان دونوں نے کہا کہ ایک دفعہ نبی کریم کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو آپ (احتراماً) کھڑے ہوگئے۔آپ کو بتایا گیا کہ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ تھا اس پر رسول کریم نے فرمایا کہ اَلَیسَت نَفسًا "کیا وہ انسان نہیں تھا"؟ (صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب من قام لجنازۃ یہودی)

ماخذ بیان کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول کریم نے خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوکر فرمایا:-

اے قریش کے گروہ تم مجھ سے کس قسم کے سلوک کی امید رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا خیر کی۔آپ ہمارے معزز بھائی ہیں اور ایک معزز بھائی کے بیٹے ہیں۔اس پر رسول کریم نے فرمایا "لَا تَثرِیبَ عَلَیکُمُ الیَومَ" کہ آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔(ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، صفحہ 733)

ماخذ بتاتے ہیں کہ عہدِ رسالت میں جہاں غیر مسلموں کے معاشی، تعلیمی سیاسی حقوق محفوظ تھے، وہیں انہیں مذہبی آزادی کا پورا اختیار تھا، چنانچہ جب نجران کے عیسائی مدینہ میں حضرت رسول کریم کے پاس حاضر ہوئے تو اس وقت آپ مسجد نبوی میں نماز عصر سے فارغ ہوئے تھے۔یہ لوگ نہایت عمدہ لباس پہنے ہوئے تھے۔جب ان کی نماز کا وقت ہوا تو وہ مسجد میں ہی نماز ادا کرنے لگے۔اس پر آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ انہیں نماز پڑھنے دو۔انہوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔(ابن ہشام، السیر النبویہ، صفحہ 396)

موجودہ زمانے میں ہم، بالخصوص ہندوستانی مسلمان تکثیری معاشرے میں رہ رہے ہیں یہاں تمام اقوام و مذاہب کے لوگ موجود ہیں، اس تکثیریت میں مسلمانوں کا رویہ غیروں کے ساتھ حسن سلوک کا ہونا چاہیے اور دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم حکمت کے دامن کو نہ چھوڑیں۔نبی اکرم ﷺ نے مکہ اور مدینہ کے تکثیری معاشرے میں غیر مسلموں کے ساتھ جو رویہ اپنایا اس کا اندازہ سطور بالا سے ہوتا ہے۔یقیناً اسوہ رسول ہی وہ واحد راستہ ہے جسے اپنا کر دنیا کے ہر شعبہ میں کامیابی اور کامرانی کی معراج کو چھوا جا سکتا ہے۔افسوس اس بات کا ہے کہ محمد ﷺ نے حسن اخلاق و کردار، حسن تعلیم و تربیت کی تلقین کی ہے۔مگر مسلم معاشرہ اخلاق کی بنیادی چیزوں سے محروم ہے۔حضور ﷺ نے فرمایا میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی نشر و اشاعت، دعوت و تبلیغ کا فریضہ حسن اخلاق سے ہی مکمل ہوا ہے۔آپ ﷺ کے حسن اخلاق کی مثالیں ماخذ میں یہ بھی ملتی ہیں کہ ثمامہ بن اثال کا واقعہ اسلام، ثمامہ اسلام کا بدترین دشمن تھا جس کو آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے اسے بغیر سزا کے معاف کر دیا۔جس پر وہ مشرف بہ اسلام ہوگیا، اسی طرح اللہ کے رسول نے عکرمہ، صفوان بن امیہ اور ابوسفیان کے ساتھ بھی حسن اخلاق کا برتاؤ کیا۔جو اس بات کی شاہد ہیں کہ آپ ﷺ کے حسن سلوک سے کئی مشرکین عرب دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے۔آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے کردار و عمل میں اسوہ رسول سے رہنمائی لے کر وہ وسعت پیدا کریں جو ہمارے نبی ﷺ کی ذات بابرکت کی خاصہ تھی۔

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

اسلام میں رزقِ حلال کی اہمیت

محمد قمرالزماں ندوی
مدرسہ نورالاسلام کنڈہ، پرتاب گڑھ

نیکی، تقویٰ اور صلاح کا مفہوم عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نماز اور روزے کی پابندی کی جائے، زکوۃ وصدقہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جائے اور اسی فریضۂ حج کی ادائیگی سے فارغ ہولیا جائے یا دوسرے الفاظ میں ظاہری رسوم اور شعائر دین کی پابندی کی جائے۔ حالانکہ ان عبادات اور مراسم کا پورا پورا فائدہ اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک ان میں اخلاص، سچی اطاعت، کامل انقیاد، رزق طیب اور مال حلال کا مادہ اور عزم شامل نہ ہو، ان اعمال کا اپنے مقام پر بہتر ہونا پسندیدہ اور مسلم ہے، مگر عبادت میں روح اس وقت پیدا ہوسکے گی جب کہ اخلاص و للّٰہیت کے ساتھ ساتھ بندے کا رزق حلال اور پاکیزہ ہو۔

چونکہ رزق کا انسانی اعمال سے بنیادی کا تعلق ہے، اس لئے قرآن کریم نے اس مسئلہ کو سمجھانے کے لئے ہر انسانی طبقہ کو مخاطب فرمایا ہے۔ عام طبقۂ انسانی کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

یآ ایھا الناس کلوا مما فی الأرض حلالاً طیباً ولا تتبعوا خطوات الشیطان إنه لکم عدوٌ مبین (سورۂ بقرہ ۱۶۸)

اے لوگو! کھاؤ اس چیز سے جو زمین میں حلال وطیب ہے، اور شیطان کے قدموں کی اتباع اور پیروی نہ کرو، یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

اس آیت میں تمام لوگوں کو ان تمام پاکیزہ چیزوں کے کھانے کا حکم ہے جو اللہ نے حلال کی ہیں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کی تاکید ہے، اس آیت سے یہ واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزیں پاک اور طیب ہیں، حرام کردہ اشیاء پاک نہیں چاہے وہ نفس کو کتنی مرغوب ہوں۔

حلالاً طیباً کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ لفظ حلّ کے اصل معنی گرہ کھولنے کے ہیں، جو چیز انسان کے لئے حلال کردی گئی گویا ایک گرہ کھول دی گئی اور پابندی ہٹادی گئی، حضرت سہل بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ نجات تین چیزوں میں منحصر ہے (۱) حلال کھانا، (۲) فرائض ادا کرنا، (۳) اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کا اتباع کرنا اور لفظ طیب کے معنی ہیں پاکیزہ جس میں شرعی حلال ہونا بھی داخل ہے اور طبعی مرغوب ہونا بھی۔

طبقۂ ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

یا ایها الذین آمنوا کلو من طیبات ما رزقنٰکم واشکروا لله ان کنتم ایاه تعبدون (سورۂ بقرہ ۱۷۲)

اے ایمان والو! کھاؤ ستھری چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو رزق دیا ہے۔ اور اللہ کا شکرادا کرو۔ اگر تم اس کو معبود سمجھتے ہو۔

طبقۂ انبیاء ورسل کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا: یآ أیها الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحاً (سورۂ مومنون: ۵۱)

اے رسولو! کھاؤ تم ستھری چیزوں سے اور نیک عمل کرو۔

مندرجہ بالا تینوں آیات قرآنی میں علاحدہ علاحدہ طبقۂ انسانی کو رزقِ حلال اور رزق طیب کھانے کا حکم فرمایا، باوجودیکہ انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کا رزق ہمیشہ ہی حلال، پاکیزہ اور طیب ہوتا ہے مگر امت کی تعلیم کے لئے اس مسئلہ کی اہمیت کو سمجھاتے ہوئے انبیاء کرام اور رسولان عظام کو بھی خطاب فرمایا۔

آخری آیت سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو اپنے اپنے وقت میں دو ہدایات دی گئی ہیں:

ایک یہ کہ کھانا حلال اور پاکیزہ کھاؤ، دوسرے یہ کہ عمل نیک اور صالح کرو۔ اور جب انبیاء علیہم السلام کو یہ خطاب کیا گیا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے معصوم بنایا ہے تو ان کی امت کے لوگوں کے لئے یہ حکم زیادہ قابل اہتمام ہے اور اصل مقصود بھی امتوں ہی کو اس حکم پر چلانا ہے، علماء نے لکھا ہے کہ ان دونوں کو ایک ساتھ لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ حلال غذا کا عمل صالح میں بڑا دخل ہے جب غذا حلال ہوتی ہے تو نیک عمل کی توفیق خود بخود ہونے لگتی ہے اور غذا حرام ہو تو نیک کام کا ارادہ کرنے کے باوجود بھی اس میں مشکلات حائل ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ بعض لوگ لمبے لمبے سفر کرتے ہیں اور غبار آلود رہتے ہیں پھر اللہ کے سامنے دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور یارب یارب پکارتے ہیں مگر ان کا کھانا بھی حرام ہوتا ہے پینا بھی، لباس بھی حرام سے تیار ہوتا ہے اور حرام ہی کی ان کو غذا ملتی ہے ایسے لوگوں کی دعا کہاں قبول ہوسکتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عبادت اور دعا کے قبول ہونے میں حلال کھانے کو بڑا دخل ہے جب غذا حرام ہو تو عبادات اور دعا کی مقبولیت کا بھی استحقاق نہیں رہتا (مستفاد معارف القرآن جلد ششم ص ۳۱۶)

اکل حرام کی نحوست

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ جسم جنت میں داخل نہ ہوگا جو حرام سے پلا ہو، ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا وہ گوشت جنت میں داخل نہ ہوگا جو حرام سے پلا ہوا ور ہر وہ گوشت جس نے حرام سے نشو ونما پائی دوزخ ہی کے لائق ہے۔ ان احادیث میں زبردست انتباہ ان لوگوں کے لئے ہے جو روٹی ہی کو مقصد زندگی بناتے ہیں اور پھر جائز ناجائز حلال و حرام ہر طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور رزقِ حلال اور کسب معاش کے معاملے میں پاکیزگی کا کوئی تصور نہیں رکھتے اور اس اعلیٰ اخلاقی قدر کو تنگ نظری اور دقیانوسی پر محمول کرتے ہیں۔ جبکہ اسلام مرد مومن کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ حرام اور ناجائز ذریعہ سے حاصل کی ہوئی روٹی (روزی) جسم کو فربہ تو بنا سکتی ہے مگر صالح اور پاکیزہ خون نہیں پیدا کرسکتی بلکہ ایسی روزی ہمیشہ انسانی قوت پرواز میں کوتاہی

پیدا کرتی ہے اسی لئے تو علامہ اقبالؒ نے کہا تھا۔

اے طائر لا ہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

رسول اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشن گوئی: آج سے چودہ سو سال قبل رسول اللہ ﷺ نے یہ پیشن گوئی کی تھی کہ لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ آدمی کو اس بات کی پرواہ نہ ہوگی کہ اس نے کس طریقہ سے مال حاصل کیا، آیا حلال طریقہ سے یا حرام طریقے سے، غور کیجئے کہ نبی کریم ﷺ کی پیشن گوئی آج کس طرح حرف بحرف ثابت ہو رہی ہے۔ آج پورا انسانی معاشرہ اس مرض میں مبتلا ہے۔ پانچ دس فیصد لوگ بھی ایسے نہیں ہیں جو جائز اور ناجائز میں تمیز کرتے ہوں۔ ہر شخص پر صرف کمانے کا بھوت سوار ہے۔ خواہ کسی طریقے سے ہو۔ حلانکہ تاجدار مدینہ محمد عربی ﷺ نے صاف صاف فرمادیا۔ ما تزال قد ما عبد یوم القیامة حتی یسأل عن أربعٍ، عن عمره فیما أفناه وعن شبابه فیما أبلاه وعن ماله من أین اکتسبه وفیما أنفقه وعن علمه ماذا عمل فیه۔

کسی بندے کا قدم اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہلے گا جب تک اس سے چار چیزوں کے متعلق پوچھ نہ لیا جائے۔ ایک عمر کہ کس میں فنا کی، دوسرے جوانی کہ کہاں اسے گزارا تیسرے مال کہ اسے کہاں سے حاصل کیا اور کس موقع پر خرچ کیا، چوتھے علم کہ اس سلسلے میں کیا عمل کیا۔

عبادت کی مقبولیت میں رزق حلال کی اہمیت: رزق حلال کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نماز روزہ حج زکوۃ اور دیگر اعمال خیر اسی وقت عنداللہ مقبول ہوں گے جبکہ انسان کا کھانا پینا اوڑھنا حلال ہو، چنانچہ ارشادِ نبویؐ ہے:

من اشتریٰ ثوبا بعشرة دراھم فی ثمنه درھم حرام لم یقبل اللہ له صلوة ما کان علیه (رواه احمد ۲/۹۸)

جس شخص نے دس درھم میں کوئی کپڑا خریدا اور صرف ایک درہم اس کی قیمت میں حرام کا شامل کر دیا تو جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر رہے گا اس کی کوئی نماز قبول نہیں کی جائے گی۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں حج کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

اذا خرج الرجل حاجا بنفقةٍ طیبةٍ ووضع رجله فی الغرز فنادی لبیك اللھم لبیك اللھم لبیك، ناداه مناد من السماء لبیك وسعدیك زادلت حلال وراحلتك حلال وحجك مبرور غیر مازور وإذا خرج الرجل بنفقة خبیثة فوضع رجله فی الغرز فنادیٰ لبیك اللھم لبیك، ناداه منادٍ من السماء لا لبیك ولا سعدیك زارك حرام ونفقتك حرام وحجك غیر مبرور (جب کوئی انسان حج کے لئے حلال مال کے ذریعہ نکلتا ہے اور اپنا پیر سواری پر رکھ کر تلبیہ پڑھتا ہے تو آسمان سے پکارنے والا پکارتے ہوئے اس کا جواب دیتا ہے کہ تیرا تلبیہ قبول ہے، کیوں کہ تیرا کھانا پینا حلال تیری سواری حلال، تیرا حج مقبول اور تیرے اوپر کوئی گناہ نہیں، اور جب کوئی آدمی حرام مال کے

ذریعہ سفر حج پر نکلتا ہے اور اپنا پاؤں سواری پر رکھ کر تلبیہ پڑھتا ہے تو آسمان سے پکارنے والا اس کے جواب میں کہتا ہے۔ تیرا تلبیہ قابل قبول نہیں تیرا کھانا حرام تیرا مال حرام تیرا حج نامقبول۔)(رواہ الطبرانی فی الاوسط ۵۲۲۴)

ایک دوسری روایت میں آپؐ نے مختلف اعمال خیر کے عند اللہ مقبول ہونے کے سلسلے میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

یا سعد أطب مطعمك تكن مستجاب الدعوة والذی نفس محمد بیده إن العبد ليقذف اللقمة الحرام فی جوفه ما يتقبل الله منه عملاً أربعين يوماً و أيما عبدٍ نبت لحمه من سحتٍ فالنار أولى به۔(رواه الطبرانی: ٦٤٩١)

اے سعد! اگر تم مستجاب الدعوات بننا چاہتے ہو تو اپنا کھانا پاک صاف اور حلال کرو اللہ تعالیٰ تم کو مستجاب الدعوات بنا دیگا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، بندہ جب کوئی حرام لقمہ اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے تو اللہ تعالیٰ چالیس روز تک اس کا کوئی عمل صالح قبول نہیں فرماتا اور جس بندہ کا گوشت حرام مال سے پل بڑھ رہا ہو اس کے لئے تو آگ (جہنم) ہی زیادہ بہتر ہے۔

عبرت کا مقام ہے کہ ایک ایک لقمۂ حرام کے اثر سے چالیس دن تک کے اعمال صالح مردود اور نامقبول ہو جاتے ہیں تو اس شخص کا کیا حال ہوگا جس کا مستقل کھانا پینا حرام ہو۔

ایک فقہی تحقیق

فقہاء و محدثین اور اہل علم نے عمل کے مقبول نہ ہونے کے تین مطالب بیان کئے ہیں (۱) عمل کو انجام دینے والا عند اللہ ملائکہ کے سامنے قابل تعریف نہیں رہتا جیسا کہ عمل صالح کرنے والا افضلیت کا مستحق ہوا کرتا ہے (۲) عمل کو انجام دینے والا اجر وثواب کا مستحق نہیں ہوا کرتا یعنی حرام سے اجتناب نہ کرنے کی وجہ سے اس کے اعمال بے وزن ہو جاتے ہیں، اور ان کو اس کا اجر و ثواب نہیں دیا جاتا۔ (۳) کبھی کبھی عدم قبولیت سے مراد یہ بھی لیا جاتا ہے کہ فعل کو انجام دینے والے کے ذمہ سے فرضیت ساقط نہیں ہوتی، یعنی حرام اکل وشرب (کھانے پینے) کے ساتھ اگر کوئی نماز روزہ اور حج وزکوۃ کے فریضہ کو ادا کرے گا، تو یہ اس کے ذمہ سے ساقط نہیں ہوں گے، اور اعمال مذکورہ کا فریضہ اس کے ذمہ میں باقی رہے گا۔

جمہور علماء کی رائے

جمہور علماء کی اس سلسلے میں رائے یہ ہے کہ حرام کھانے پینے اور لباس میں مبتلا شخص کے اعمال قبول نہ ہونے سے مراد پہلے اور دوسرے معنی ہیں، تیسرے معنی مراد نہیں ہیں، یعنی مذکورہ شخص کے اعمال کو انجام دینے کی وجہ سے فرائض تو اس کے ذمہ سے ساقط ہو جائیں گے لیکن اللہ کے نزدیک وہ قابل تعریف اور لائق تحسین نہ ہوگا، اور اسی طرح اجر وثواب سے بھی اس کو محروم کردیا جائے گا۔

رزق کے اثرات انسانی زندگی پر

جس طرح ماحول آب وہوا کے اثرات انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں، ٹھیک اسی طرح رزق حلال اور رزق حرام کے بھی اثرات انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں، اسی لئے

آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا "اولادکم من کسبکم" یعنی تمہاری اولاد پر بھی تمہارے کسب اور رزق کا اثر پڑے گا۔ (حدیث)

یعنی جس طرح والدین کے اخلاق، امراض اولاد کے بدن میں منتقل ہوجاتے ہیں، اسی طرح رزق حرام کے باطنی اثرات کا بھی اولاد پر منتقل ہوجانا ناممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اولاد نافرمان اور بدعمل پیدا ہورہی ہے، اخلاق و کردار سے وہ خالی نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ جب رزق حاصل کرنے میں حلال وحرام کی تمیز نہ ہوتو جو رزق حرام ہوگا اس سے اولاد بھی ایسی ہی نافرمان اور گستاخ ہوگی جو ماں باپ کی نافرمان اور بے ادب ہوگی۔ اسی طرح آج کے اس دور میں نمازوں میں جی نہ لگنا، اخلاقی گراوٹ، تہذیب و شائستگی کا اٹھ جانا سب اسی رزق حرام کا اثر ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کا مال مشتبہ سے احتیاط: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب کوئی غذا کھانے کا ارادہ کرتے تو سب سے پہلے اس کی حلت وحرمت کے بارے میں معلوم کر لیتے۔ صحابہ کرامؓ حرام اور ناجائز طریقے سے مال کمانا پسند کرتے تھے اور نہ کھانا۔ الا یہ کہ اگر ناجائز غذا ناواقفیت کی وجہ سے حلق میں اتر جاتی اور بعد میں معلوم ہوتا کہ اس کا کھانا جائز نہ تھا تو قئے کر کے اس غذا کو اندر سے باہر پھینک دیتے۔ اور اس سے خون یا گوشت کو غذا پہنچانا برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ حدیث کی کتابوں میں موجود ہے کہ ایک بار ان کے غلام نے کوئی چیز ان کو کھانے کے لئے پیش کی آپؓ نے اسے یہ سمجھ کر کہ یہ حلال کمائی کی ہے، تناول فرمالیا۔ جب کھا چکے تو معلوم ہوا کہ یہ کھانہ مشتبہ تھا، آپؓ نے اپنا ہاتھ حلق میں ڈالا اور جو کچھ کھایا تھا قئے کردیا۔

رزقِ حلال کی فکر ہر مومن کی ذمہ داری ہے: رزق حلال کی فکر اور اس کا حصول ہر مومن پر فرض ہے، اگر کوئی شخص اس سلسلے میں راہِ فرار اختیار کرتا ہے اور ہر طرح کے جائز اور ناجائز مال سے اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ بھرتا ہے تو گویا وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتا ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ پاک ہے، اور صاف ستھری چیزوں کو ہی قبول فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے کہ جن کا حکم انبیاء اور رسل کو دیا گیا تھا، چنانچہ ارشاد ربانی ہے اے پیغمبرو! پاک صاف چیزیں کھاؤ اور اعمالِ صالحہ کرو۔

مذہب اسلام نے جہاں کسب معاش کا حکم دیا وہیں بڑی وضاحت کے ساتھ اس کے اصول وضوابط کو بیان کردیا کہ وہ مال حلال ہو، حرام نہ ہو، جائز ہو، ناجائز نہ ہو۔ اگر آج معاشی طور سے اس تباہ کن دور میں رزق حلال کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور حرام سے بچا جائے تو دینی اصلاح کے علاوہ اخلاقی اصلاح کی بھی قوی امید ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو رزقِ حلال سے لذت آشنا کرے، اس کی توفیق دے اور مالِ حرام سے بچنے کی ہم سب کو توفیق مرحمت فرمائے: آمین۔

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

رشوت-ہمارے سماج کا ایک ناسور

مولانا ندیم احمد انصاری
(ڈریکٹر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن، انڈیا)

رشوت یا کرپشن کی تاریخ بہت قدیم ہے، یہ آج کا مسئلہ نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس پر کبھی مکمل طور پر قابو نہیں پایا جا سکا۔ اس وقت ترقی یافتہ اور ترقی پذیر تمام ممالک اس کی لپیٹ میں ہیں، اس سے جمہوری نظام کی عمارت گویا چرمرا کر رہ گئی ہے۔ یہ بدعنوانی انصاف میں رکاوٹ اور معاشی و معاشرتی ترقی میں سُستی کی محرک ہے۔ آج کے برق رفتار زمانہ میں ہر چیز شاخ در شاخ ہوتی جا رہی ہے، آج نیکیوں کے راستے بھی اَن گِنت ہیں اور گناہ کے بھی، یہ انسان کا اختیار ہے کہ وہ اپنے لیے کیا پسند کرتا ہے۔ 'رشوت' جو کہ ہمارے سماج کا ایک ناسور ہے، جس نے نہ جانے کتنی زندگیاں تباہ و برباد کر دیں، لیکن اس پر کسی طرح روک تھام لگتی نظر نہیں آتی۔ آج کے اس 'ترقی یافتہ دور' میں اس کی کوئی خاص صورت متعین کر پانا نہایت مشکل امر ہو گیا ہے، اب یہ معاملہ محض نوٹوں کے سہارے ہی نہیں طے پاتا بلکہ کوئی 'ہدیہ' 'تحفہ' بھی اس کے قائم مقام ہو سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر رشوت، بدعنوانی کی ایک ایسی قسم ہے، جس میں نقد یا تحفہ وغیرہ دے کر، وصول کرنے والے کے طرزِ عمل میں بدلاؤ لایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد وصول کنندہ کے اعمال پر اثر انداز ہونا ہوتا ہے۔ کبھی یہ پیش کش دینے والوں کی طرف سے ہوتی ہے، کبھی لینے والے، اسے کمیشن یا ڈونیشن جیسے نام سے موسوم کر کے اسے جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کی اصل حقیقت سب پر عیاں ہے۔

رشوت، یوں تو خود ہی ایک لعنت ہے، جس کے سبب انسان خدا کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے، لیکن کسی مظلوم سے رشوت کا مطالبہ کرنا انسانیت سے نہایت درجہ پست اور گرا ہوا عمل ہے، جیسا کہ بعض جگہوں پر قیدیوں کے لواحقین سے بھی رشوت وصول کی جاتی ہے اور اس کے بدلے قیدیوں کو بدسلوکی سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اسلام نے ہر اس ذریعہ اکتساب کو ممنوع قرار دیا ہے، جس میں کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا لازم آتا ہو، منجملہ ان ذرائع کے رشوت بھی ہے، یہ نہایت سنگین جرم ہے، جو

ہمارے پورے معاشرے میں پھیل چکا ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں جگہ جگہ اس کے خاتمہ کی باتیں تو کی جاتی ہیں، لیکن ایسا کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا جاتا، جس کا فائدہ یقینی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم اور طب کے ادارے؛ جو کہ خالص انسانی فلاح و بہبود کے لیے وجود میں آتے ہیں، وہ بھی بدعنوانیوں سے پاک نہیں۔ افسوس تو اس بات پر ہے کہ وہاں جو ''سوشل ورکر'' بیٹھے ہوئے ہیں، وہ بھی اس بدعنوانی میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے ہیں، لیکن کوئی انھیں پوچھنے والا نہیں، اب تو عوام بھی اس کے عادی ہو چکے ہیں اور حکومت کی تو شاید انھیں سرپرستی حاصل ہے۔

رشوت ایک ایسا جرم ہے، جو شاید کسی بھی نظامِ حیات میں جائز نہ ہو۔ ہمارا (ملکی) قانون بھی اسے ناجائز قرار دیتا ہے، لیکن ملک کی جیتی جاگتی زندگی میں آکر دیکھیے تو وہی رشوت؛ جسے قانون میں بدترین جرم کہا گیا ہے، نہایت آزادی کے ساتھ لی اور دی جا رہی ہے۔ ایک معمولی کانسٹیبل سے لے کر اونچے درجے کے افسران تک، اسے شیرِ مادر سمجھے ہوئے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جس کی جیب گرم ہو، وہ سیکڑوں جرائم میں ملوث ہونے کے باوجود بڑی ڈھٹائی کے ساتھ دندناتا پھرتا ہے اور جس کی جیب خالی ہو، وہ سو فیصد معصوم اور برحق ہونے کے باوجود انصاف کو ترس کر جان دے دیتا ہے، اس صورتِ حال کو مضبوط اور ایماندارانہ انتظامیہ ہی ختم کر سکتی ہے۔ اگر اونچے درجے کے رشوت خور افسروں کو چند بار علی الاعلان عبرت ناک جسمانی سزائیں دی جائیں اور آئندہ رشوت کے لیے کچھ اور سخت سزائیں مقرر کر دی جائیں، تو رفتہ رفتہ یہ لعنت مٹ سکتی ہے۔ (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۷/۹۷)

رشوت کی تعریف

رشوۃ 'رشــأ' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی اس رسّی کے ہیں، جس کے ذریعے پانی تک پہنچا جائے۔ چوں کہ رشوت کے ذریعے بھی اسی طرح ایک مقصد تک پہنچا جاتا ہے، اس لیے اسے 'رشوت' کہتے ہیں۔ یہ لفظ رِشوت اور رُشوت؛ دونوں طرح صحیح ہے۔ رشوت دینے والے کو 'راشی' لینے والے کو 'مرتشی' اور دونوں کے مابین واسطہ بننے والے کو 'رأش' کہتے ہیں۔ (النہایۃ لابن اثیر: ۲/۲۶۲)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لعن اللہ الراشیَ والمرتشی والرائشَ. (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۴۱۵)

رشوت لینے والے، دینے والے اور ان دونوں کے درمیان واسطہ بننے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

علامہ شامیؒ نے رشوت کی بہت جامع تعریف اس طرح کی ہے:

رشوت وہ ہے، جسے ایک شخص کسی حاکم وغیرہ کو اس لیے دیتا ہے، تاکہ وہ اس کے حق میں فیصلہ کر دے یا اسے وہ ذمہ داری دے دے، جسے یہ چاہتا ہے۔ (شامی، کتاب القضاء، مطلب فی الکلام علی الرشوۃ)

انھوں نے اس تعریف سے یہ واضح کر دیا کہ رشوت عام ہے، چاہے وہ مال ہو یا کسی اور طرح کی کوئی منفعت

اور حاکم سے مراد 'قاضی' (جج) ہے اور 'وغیرہ' سے مراد ہر وہ شخص، جس کے ہاں رشوت دینے والے کی مصلحت پوری ہوسکتی ہو، چاہے اس کا تعلق حکمرانوں سے ہو یا سرکاری ملازمین سے یا خاص اعمال بجالانے والے ذمہ داروں سے۔ مثلاً تاجروں، کمپنیوں اور جاگیرداروں وغیرہ کے نمائندے وغیرہ۔ 'فیصلہ' سے مراد یہ ہے کہ رشوت لینے والا، رشوت دینے والے کی مرضی کے مطابق فیصلہ کردے، تاکہ رشوت دینے والے کا مقصد پورا ہو جائے، خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر۔ (مقالات وفتاویٰ عبد العزیز بن عبداللہ بن باز:324)

فقہ کی اصطلاح میں رشوت اس مال کو کہتے ہیں، جو کسی کے حق کو باطل کرنے کے لیے یا کسی باطل کو حاصل کرنے کے لیے دیا جائے۔ مایعطی لابطال حق أو إحقاق باطل. (التعریفات:۱۲۵)

رشوت کی شرعی تعریف یہ ہے کہ جس کا معاوضہ لینا شرعاً درست نہ ہو، اس کا معاوضہ لیا جائے، مثلاً جو کام کسی شخص کے فرائض میں داخل ہے اور اس کا پورا کرنا اس کے ذمہ لازم ہو، اس پر کسی فریق سے معاوضہ لینا۔ جیسے حکومت کے افسر اور کلرک وغیرہ سرکاری ملازمت کی رو سے اپنے فرائض ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں، پھر وہ صاحبِ معاملہ سے کچھ لیں، تو یہ رشوت ہے۔ یا لڑکے یا لڑکی کے ماں باپ، اُس کی شادی کے ذمہ دار ہیں، کسی سے اس کا معاوضہ نہیں لے سکتے، وہ جس کو رشتہ دیں، اس سے کچھ معاوضہ لیں، تو وہ رشوت ہے۔ یا صوم وصلوٰۃ اور حج و تلاوتِ قرآن؛ عبادات ہیں، جو مسلمان کے ذمہ ہیں، اُن پر کسی سے کوئی معاوضہ لیا جائے تو وہ رشوت ہے۔ البتہ فی زمانناتعلیمِ قرآن اور عام نمازوں کی امامت اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (علی فتوی المتأخرین)

پھر جو شخص رشوت لے کر کسی کا کام حق کے مطابق کرتا ہے، وہ رشوت لینے کا گنہگار ہے اور یہ مال اس کے لیے سُحت اور حرام ہے اور اگر رشوت کی وجہ سے حق کے خلاف کام کیا، تو یہ دوسرا شدید جُرم ؛ حق تلفی اور حکمِ خداوندی کو بدل دینے کا اس کے علاوہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس لعنت سے بچائے۔ آمین۔ (معارف القرآن:۱۵۲/۳-۱۵۱، بتغیر)

رشوت کا وبال

رشوت خوروں کے متعلق ارشادِ ربانی ہے: ﴿اکلون للسحت﴾ ۔(المائدۃ:۴۲) یعنی یہ لوگ سُحت کھانے والے ہیں۔ سُحت کے لفظی معنی کسی چیز کو جڑ، بنیاد سے کھود کر برباد کرنے کے ہیں۔ اس معنی میں قرآن کریم نے فرمایا ہے ﴿فیسحتکم بعذاب﴾ یعنی اگر تم اپنی حرکت سے باز نہ آؤ گے، تو اللہ تعالیٰ اپنے عذاب سے تمھارا استیصال کردے گا، یعنی تمھاری جڑ، بنیاد ختم کر دی جائے گی۔ قرآن مجید میں اس جگہ لفظ سُحت سے مراد رشوت ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ، ابراہیم نخعیؒ، حسن بصریؒ، مجاہدؒ، قتادہؒ اور ضحاکؒ وغیرہ ائمۂ تفسیر نے اس کی تفسیر رشوت سے کی ہے۔

رشوت کو سُحت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف

لینے دینے والوں کو برباد کرتی ہے، بلکہ پورے ملک وملت کی جڑ، بنیاد اور امن عامّہ کو تباہ کرنے والی ہے۔ جس ملک یا محکمہ میں رشوت چل جائے، وہاں قانون معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور قانونِ ملک ہی وہ چیز ہے، جس سے ملک وملت کا امن برقرار رکھا جاتا ہے، وہ معطل ہو گیا، تو نہ کسی کی جان محفوظ رہتی ہے، نہ آبرو، نہ مال۔ اس لیے شریعتِ اسلام میں اس کو سُحت فرما کر اشدّ حرام قرار دیا ہے اور اس کے دروازہ کو بند کرنے کے لیے امراء وحکام کو ہدیے اور تحفے پیش کیے جاتے ہیں، ان کو بھی صحیح حدیث میں رشوت قرار دے کر حرام کر دیا گیا ہے۔ (معارف القرآن:۳/۱۵۱)

ایک مقام پر ارشادِ ربانی ہے:

﴿ ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل و تدلوا بها الى الحكام لتأكلوا فريقاً من أموال الناس بالاثم وأنتم تعلمون﴾۔

اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ اس کو (رشوت کے طور پر) حاکموں کے پاس پہنچاؤ کہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ناجائز طور پر کھا جاؤ اور (اسے) تم جانتے بھی ہو۔ (سورۃ البقرۃ:۱۸۸)

معلوم ہوا رشوت باطل طریقے سے مال کھانے کی صورتوں میں انتہائی بدترین صورت ہے، کیوں کہ اس میں دوسرے شخص کو مال دے کر اسے حق سے منحرف کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

كل لحم أنبته السحتُ فالنارُ أولىٰ به.

ہر وہ گوشت، جو حرام مال سے پرورش پائے، جہنم کی آگ ہی اس کے لیے زیادہ بہتر ہے۔

کسی نے عرض کیا: حرام مال سے کیا مراد ہے؟

تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **الرشوة فى الحكم۔**

(کسی بھی قسم کا) فیصلہ کرنے کے لیے رشوت قبول کرنا۔ (تفسیر ابن جریر الطبری:۶/۱۵۶)

حضرت عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

ما من قوم يظهر فيها الربا الا أخذوا بالسنة، وما من قوم يظهر فيهم الرُّشا الا أخذوا بالرعب.

جس قوم میں سود عام ہو جاتا ہے، وہ قحط سالی میں مبتلا ہو جاتی ہے اور جس قوم میں رشوت عام ہو جاتی ہے، اس پر دشمن کا رعب طاری ہو جاتا ہے۔ (مسند احمد:۴/۲۰۵)

معاشرہ پر رشوت کے اثرات

بلا شک وشبہ جب گناہوں کا چلن عام ہو تو معاشرہ اختلاف وانتشار کا شکار ہو جاتا ہے، معاشرہ کے افراد میں محبت کے رشتے منقطع ہو جاتے ہیں، بغض وعداوت اور نیکی کے کاموں میں عدم تعاون پیدا ہو جاتا ہے۔ معاشرہ پر رشوت کے بدترین اثرات میں سے یہ بھی ہے کہ گھٹیا اور رذیل باتیں عام ہو جاتی ہیں، اچھی اور خوبی کی باتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس طرح کے گناہوں کی وجہ سے جب ایک دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہے، تو پھر معاشرہ کے افراد ایک

دوسرے پر ظلم کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں، اس لیے کہ ظلم کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ ان جرائم میں سے ہے، جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنتے ہیں اور مسلمانوں میں بغض وعدوات کا۔ نیز عام آفتوں اور فتنوں کا بھی، جیسا کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب لوگ برائی دیکھیں اور اسے نہ مٹائیں، تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے عذاب کی لپیٹ میں لے لے۔'' (مقالات وفتاویٰ عبد العزیز بن عبداللہ بن باز: ۳۲۸، اردو، بتغیر)

رشوت کے بدترین نتائج

رشوت کے جو بدترین اثرات ونتائج مرتَّب ہوتے ہیں، ان میں سے یہ بھی ہے کہ اس سے کمزوروں پر ظلم ہوتا ہے، ان کے حقوق کو سلب یا ضایع کر دیا جاتا ہے، یا ناحق طور پر محض رشوت کی کارستانی کی وجہ سے انھیں اپنے حق کے حاصل کرنے میں بہت تاخیر ہو جاتی ہے۔ رشوت کا ایک بدترین نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ رشوت لینے والے قاضی اور سرکاری ملازم وغیرہ کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں، وہ اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کرنے لگتا ہے، رشوت نہ دینے والے کے حق کو کھا جاتا ہے یا اسے بالکل ضایع کر دیتا ہے۔ رشوت لینے والے کا ایمان بھی کمزور ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے غضب اور اس کی طرف سے دنیا وآخرت کی شدید سزا کا مستحق قرار دے لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فوراً سزا نہ دے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے غافل ہے (نعوذ باللہ) بلکہ بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم کو آخرت سے پہلے دنیا میں بھی سزا دیا کرتا ہے، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے: حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سرکشی اور قطع رحمی ایسے خطرناک گناہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا ارتکاب کرنے والے کو دنیا میں بھی جلد سزا دیتا ہے اور آخرت میں جو سزا تیار کر رکھی ہے، وہ اس کے سوا ہے۔'' بے شک رشوت اور ظلم کی دیگر تمام صورتوں کا تعلق اسی سرکشی سے ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیے رکھتا ہے، حتی کہ جب اسے پکڑ لیتا ہے، تو پھر نہیں چھوڑتا''۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وكذلك أخذ ربك اذا أخذ القرى وهي ظالمة إن أخذه أليم شديد﴾ ۔(سورہ ہود:۱۰۲) اور تمھارا پروردگار جب نافرمان بستیوں کو پکڑتا ہے، تو اس کی پکڑ اسی طرح ہوتی ہے۔ بے شک اس کی پکڑ بڑی دردناک اور سخت ہے۔ (مقالات وفتاویٰ عبد العزیز بن عبداللہ بن باز: ۳۲۹، اردو، بتغیر)

رشوت لینا دینا

رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے کی بھی ممانعت فرمائی ہے اور رشوت دینے کی بھی۔ البتہ رشوت لینا تو بذات خود حرام ہے، اس لیے یہ کسی صورت میں جائز نہیں۔ لیکن رشوت دینا چوں کہ رشوت لینے والے کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث ہے اور اس کا مقصود حرام کی تحصیل یا دوسرے شخص کو اس کے جائز حق سے محروم کرنا ہے، اس لیے اس کی ممانعت کی گئی ہے، لہٰذا رشوت دینا اس وقت

جائز ہے، جب اس کا مقصد اپنے آپ کو ظلم سے بچانا یا صرف انصاف کا حاصل کرنا ہو۔جیسا کہ علماء نے لکھا ہے کہ کسی شخص سے جان یا مال کا خوف ہو یا خود بادشاہ یا حکومت وغیرہ سے اس کے ظالمانہ طبیعت ومزاج کے پیش نظر ظلم کا اندیشہ ہو تو اس سے بچنے کے لیے رشوت دینا جائز ہے، البتہ یہ رقم لینے والے کے لیے لینا ہر حالت میں حرام ہے۔

فتاویٰ حقانی میں ایک سوال ہے کہ کیا کام میں رکاوٹ پیدا ہونے کے خوف سے ٹھیکیدار کا افسرانِ بالا کو رشوت دینا جائز ہے؟ جس کا جواب یوں دیا گیا کہ ٹھیکہ دینے کے بدلے جو افسران کمیشن کے نام پر پیسے لیتے ہیں، وہ رشوت میں داخل ہے۔ کام کی نگرانی کرنا، ان کا فریضۂ منصبی ہے، اس کے بدلے وہ حکومت سے تنخواہ لیتے ہیں۔ لہٰذا اگر ٹھیکیدار ٹھیکہ لینے کا حق دار ہو اور بغیر رشوت کے اسے ٹھیکہ نہ دیا جاتا ہو، تو بحالتِ مجبوری اس کو تو رشوت دینے کی رخصت ہے، مگر افسران بالا کے لیے لینا ہرگز حلال نہیں۔(۲۷۳/۶)

جدید فقہی مسائل میں ہے:

رشوت جس طرح لینا حرام ہے، اسی طرح اصولی طور پر دینا بھی حرام ہے۔اس سلسلہ میں فقہاء کے یہاں ایک متفق علیہ اصول ہے کہ جس چیز کا لینا جائز نہیں، اس کا دینا بھی جائز نہیں: 'ماحرم أخذہ، حرم أعطاہ'۔

البتہ چوں کہ رشوت لینا کبھی بھی مجبوری نہیں بن سکتی اور رشوت دینا بعض دفعہ مجبوری بن جاتی ہے، اس لیے فقہاء نے ضرورت اور مجبوری کے مواقع پر رشوت دینے کی اجازت دی ہے اور اس سلسلہ میں حضور ﷺ کے اس عمل کو پیش نظر رکھا ہے کہ آپ ﷺ بعض شر پسند شعراء کو اس لیے کچھ دیا کرتے تھے کہ وہ بے ہودہ ہجو پر مبنی اشعار کہنے اور مسلمانوں کو بدنام کرنے سے اجتناب کریں۔

رشوت دینے کی گنجائش کب ہوگی؟ اس سلسلہ میں فقہاء نے یہ اصول متعین کیا ہے کہ اگر رشوت نہ دے تو ناحق طریقہ پر اس کو جانی یا مالی نقصان کا اندیشہ ہو کہ جس ذمہ دار کے پاس اس کی درخواست زیر غور ہے، وہ اس کے ساتھ انصاف سے کام نہ لے گا اور اس کے اور دوسرے امیدواروں کے درمیان مساویانہ سلوک روا نہیں رکھے گا۔

علامہ ابن نجیم مصریؒ لکھتے ہیں:

الرشوة لخوف علی نفسه أو ماله أو ليوسی أمره عند السلطان أو أمير. (الاشباہ والنظائر:۱/۳۰)

جان یا مال پر خوف کی وجہ سے، نیز اس لیے کہ سلطان یا امیر اس کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرے، رشوت دینے کی گنجائش ہے۔ یہ ممنوع صورتوں سے مستثنیٰ ہے۔(۱/۳۰۲،بتغیر)

اللہ تعالیٰ ہمارے پورے معاشرے اور سماج کو اس لعنت اور تمام برائیوں سے محفوظ رکھے۔ آمین

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

تعمیرِ سیرت میں اچھے ہم نشین کا کردار

حافظ کلیم اللہ عمری

کسی انسان کی نیک سیرت کے پیچھے یقیناً نیک دوست احباب کا بڑا اہم رول ہوتا ہے، اس لئے ہر انسان کو نیک دوستوں کی ہم نشینی اختیار کرنی چاہئے، اسلام نے نیک دوست احباب کو بڑی اہمیت دی ہے، بلکہ ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ اچھے دوست کا انتخاب کریں، اس لئے کہ آدمی اپنے دوست کے طور طریقوں سے متاثر ہوتا ہے، اور ہمیں یہ بھی تعلیم دی گئی ہے کہ کسی کے اخلاق وکردار کا اندازہ لگانا ہوتو اس کے ہم نشینوں کو دیکھو۔

اس دنیا میں نبی کریم ﷺ سے بہتر اور نیک کون ہوسکتا ہے، آپ کی صحبت میں رہ کر بگڑے ہوئے لوگ نیک اور بااخلاق بن گئے، یہ آپ کی صحبت ہی کا اثر تھا کہ عرب کے جنگجو آپس میں بھائی بھائی بن گئے، آپ کی صحبت وتربیت اور اصلاح کے مؤثر طریقے نے نوع انسانی کی ہر بے راہ روی کو دور کردیا اور انسان کو اچھا انسان بنادیا، بڑے سے بڑے بدکار، سیاہ کار، خواہشات نفس کے غلام، اللہ واحد کے چیدہ، چنندہ، اور برگزیدہ بندے بن گئے۔

قرآن کریم میں اہل ایمان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ مومن کی دوستی مومنوں سے ہی ہو، اس لئے کہ ایمانی رشتہ دنیا کے تمام رشتوں سے زیادہ قوی اور مضبوط ہوتا ہے۔ اور ایسے غیر مسلموں کی دوستی سے منع کیا گیا ہے جو دین کو ہنسی مذاق کا ذریعہ بناتے ہیں، ارشاد باری تعالی ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ، (المائدة ، ۵۷ ،) ﴾ اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتابیں دی گئی تھیں اُن کو اور کافروں کو جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے دوست نہ بناؤ اور مومن ہوتو اللہ سے ڈرتے رہو ﴾۔

عقائد کے باب میں ایک اہم باب الولاء والبراء کا ہے، یعنی اللہ اور اللہ والوں سے دوستی کرنا اور شرک اور اہل شرک سے براءت کا اظہار قولا وعملا کرنا، دوستی ہوگی تو اللہ کی خاطر اور دشمنی ہوگی تو بھی اللہ ہی کی خاطر۔ اچھے احباب کا حسن انتخاب اور برے احباب اور ان کی مجلس سے دوری بھی اللہ ہی کی خاطر ہوگی۔

تعمیرِ سیرت قرآن کریم کے آئینے میں: قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اچھے احباب اور ان کی ہم نشینی کے خوشگوار اثرات کا ذکر خیر ملتا ہے، مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ سورۂ یوسف میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ قید خانے کے قیدیوں کو جب حضرت یوسف علیہ السلام کی صحبت اور ہم نشینی نصیب ہوئی تو ان کی دنیا بدل گئی۔ سچ ہے: اچھا دوست مشک کے مانند ہوتا ہے جس کی دوستی ہم نشینوں کو بھی معطر کر دیتی ہے۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر نبی اکرم ﷺ کو یہ تعلیم دی گئی کہ ایمان والوں کو اپنی مجلس سے دور نہ کریں، ان کی قدر کریں، اگرچہ کہ اہل کفران کی غریبی کا مذاق اڑاتے ہوں، اشراف قریش کو ان کے ساتھ بیٹھنا گوارا نہ ہو، جیسا کہ حضرت سعد ابن وقاصؓ فرماتے ہیں کہ ہم چھ آدمی نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے، میرے علاوہ بلال، ابن مسعود، ایک ہذلی اور دو صحابہ اور تھے۔ (رضی اللہ عنہم) قریش مکہ نے خواہش ظاہر کی کہ ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹا دو تاکہ ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی بات سنیں، نبی کریم ﷺ کے دل میں آیا کہ چلو شاید میری بات سننے سے ان کے دلوں کی دنیا بدل جائے، لیکن اللہ نے سختی کے ساتھ ایسا کرنے سے منع فرمایا، (صحیح مسلم) پھر آپ پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، ارشاد ربانی ہے، وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا.. (الکھف، ۲۸)

’’اور جو لوگ صبح و شام اپنے رب کو پکارتے اور اُس کی خوشنودی کے طالب ہیں اُن کے ساتھ صبر کرتے رہو اور تمہاری نگاہیں ان میں سے (گزر کر اور طرف) نہ دوڑیں کہ تم آرائش زندگی دنیا کے طلبگار ہو جاؤ، اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا ہے اس کا کہنا نہ ماننا‘‘۔

مقصد امت کو سمجھانا ہے کہ بے وسائل لوگوں کو حقیر سمجھنا یا ان کی صحبت سے گریز کرنا اور ان سے وابستگی نہ رکھنا یہ نادانوں کا کام ہے، اہل ایمان کا نہیں۔ اہل ایمان تو اہل ایمان سے محبت رکھتے ہیں، چاہے وہ غریب اور مسکین ہی کیوں نہ ہوں۔ (احسن البیان، ۳۵۸)

موجودہ دور مادہ پرستی کا دور ہے۔ دولت ہی ہر معاملہ میں معیار ہے۔ لوگ دولت مندوں سے محض ان کی دولت کی وجہ سے دوستی کرنا چاہتے ہیں، بھلے ہی ان میں کتنا ہی بگاڑ اور فساد کیوں نہ ہو اور غریبوں سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں، بھلے ہی وہ ایمان و کردار میں کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں۔ ایسے لوگوں کے لئے مذکورہ آیت اپنے اندر بڑا قیمتی پیغام رکھتی ہے۔

تعمیرِ سیرت احادیث کی روشنی میں: احادیث میں بھی تعمیر سیرت میں اچھے ہم نشین کے کردار کو واضح کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کی چند احادیث درج ذیل ہیں:

۱)۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: لا تصاحب الا مومنا ولا یأکل طعامک الا تقی، (سنن ابی داؤد

، ۴۸۳۲ حسنــه الألباني) '' تم مومن سے ہی دوستی کرو، اور تمہارے دسترخوان پر متقی انسان ہی کھائے''۔

۲) مثل الجليس الصالح والجليس السوء كمثل صاحب المسک وكير الحداد لا يعدمک من صاحب المسک اما تشتريه او تجد ريحه وكير الحداد يحرق بدنک او ثوبک أو تجد منه ريحا خبيثة ، '' اچھے دوست اور برے دوست کی مثال مشک فروخت کرنے والے اور آگ کی بھٹی دھونکنے والے کی طرح ہے، مشک بیچنے والا یا تو تجھے خوشبو تحفے میں دے دے گا یا تو خود اس سے خریدے گا۔ (یہ دونوں صورتیں نہ ہوں تب بھی) تو اس سے پاکیزہ خوشبو پالے گا ، البتہ برے ہم نشین (بھٹی دھونکنے والا) کی صحبت کا نقصان اس طرح ہوگا کہ اس آگ کی چنگاری تیرے جسم کو جلادے گی ، یا کپڑے جل جائیں گے، یا آخری صورت یہ ہوگی کہ گرمی کی وجہ سے اس سے تو بدبو محسوس کرلے گا''۔(صحیح البخاری،۲۱۰۱)

اس حدیث میں نیکوں کی صحبت اختیار کرنے کا فائدہ اور بروں کی صحبت کا نقصان تمثیلی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ نیک لوگوں کی صحبت میں عطرفروش کی طرح فائدہ ہی فائدہ ہے، ان کی صحبت کے اچھے اثرات ضرور مرتب ہوں گے۔ اس کے برخلاف بروں کی صحبت اسی طرح نقصان کا باعث ہوگی جس طرح لوہار کی بھٹی میں بیٹھنے والا ، سراسر نقصان اٹھاتا ہے۔ سچ فرمایا ہے شیخ سعدیؒ نے ۔

صحبت صالح ترا صالح کند،

صحبت طالح ترا طالح کند

۳. الرجل على دين خليله فلينظر احدكم من يخالل ، (صحيح الجامع الصغير وزيادته ، ۳۵۴۵، حسنه الألباني)

'' آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، پس تم میں سے ہرکوئی یہ دیکھے کہ وہ کس کے ساتھ دوستی کررہا ہے''۔ یعنی دوست کی دوستی کا بڑا اثر ہوتا ہے،خصوصاً صحبتے با اولیاء یا صحبتے با اہل دل کی مجلسوں سے مستفید ہونے والوں کی بڑی تعداد ہے،لوگ اپنے مشائخ وصوفیاءکرام کی مجلسوں میں شریک ہوکر اچھے انسان بلکہ اچھے مسلمان ، نیک طینت وفطرت بن کر لوٹتے تھے اپنے گناہوں سے توبہ کرتے اوراللہ تعالی کے سچے بندے بن کر زندگی گزارتے تھے، آج بھی مصلحین کی مجلسوں سے یہ ممکن ہے کہ لوگ اپنے عقائد،عبادات،معاملات،معاشرت اور اخلاقیات کو سنواریں، نیک بندوں کی کمی نہیں ، ایک ڈھونڈو تو ہزار ضرور مل جائیں گے،تقریروں اورتحریروں سے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوگا جو نیک لوگوں کی صحبت سے، ان کی مجلسوں سے استفادہ کا موقع ضرور ملے گا،اللہ والوں کی پہچان یہی ہے کہ وہ ایمان کامل کے ساتھ عمل صالح ، اخلاص وللّٰہیت ، اتباع سنت کے شیدائی ہوں گے ، دنیاداری کے مقابلہ میں دینداری کو ترجیح دیں گے، دنیا سنوارنے کی بجائے اخروی زندگی کی فکر دامن گیر ہوگی ، سیدھی سادھی زندگی کے عادی ہوں گے، سب سے اہم بات یہی ہوگی کہ ان کے قول وعمل میں تضاد نہ ہوگا، جن کے دلوں میں خشیت الٰہی داخل ہوگی ، کوئی بھی قول وعمل

کتاب وسنت کے خلاف نہ ہوگا، ایسے لوگوں کی تلاش اور ان کی صحبت سے دل کی دنیا بدل جاتی ہے، دین ودنیا کی سعادت حاصل ہوتی ہے،

شخصیت سازی میں اچھے ہم نشین کا کردار: تعمیر سیرت میں یقیناً نیک لوگوں کی صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے، جیسے مشک کی خوشبو خود بخود اطراف واکناف میں پھیلتی اور ماحول کو معطر کرتی ہے خواہ اردگرد کے لوگ خوشبو سونگھنے کا ارادہ رکھتے ہوں یا نہ ہوں، اسی طرح نیک صحبت بھی لازماً اپنا اچھا اثر ڈالتی ہے، خواہ نیک لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے والے اچھا اثر قبول کرنے کی نیت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔

نیک لوگوں کی صحبت سے خیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، خیر سے محبت پیدا ہوتی ہے، بلکہ غیر ارادی طور پر اچھائی سے محبت پیدا ہوجاتی ہے، اچھے ساتھی ملنے کی صورت میں انسان قوت محسوس کرتا ہے۔ نیک لوگوں کی صحبت تعمیر سیرت میں مد ومعاون ثابت ہوتی ہے، اور یہی دوستی شخصیت سازی کے مراحل کو آسان کرتی ہے۔

حضرت عبید اللہ بن عبد اللہؒ جو مشہور وممتاز تابعین میں شمار ہوتے ہیں، آپ کی نمازیں بڑی طویل ہوتی تھیں، حدیث، فقہ، شعروشاعری اور دیگر علوم میں پورا درک حاصل تھا، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ جیسے مردصالح پر ان کے اخلاق کمالات کا اتنا اثر تھا کہ وہ فرمایا کرتے تھے، عبید اللہؒ کی ایک صحبت اور تھوڑی دیر کی ہم نشینی مجھے دنیا ومافیہا سے عزیز ہے، خدا کی قسم ان کی ایک رات کی صحبت بیت المال کے ایک ہزار دینار سے خریدنے کو تیار ہوں۔ (بحوالہ، تزکیہ نفس، بنت الاسلام، ص ۲۳۰)

نیکوں کی صحبت سے اللہ تعالی یاد آتا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے عقیدت ومحبت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس بروں کی ہم نشینی سے انسان شیطان کا دوست بن جاتا ہے۔

نیک لوگوں کی صحبت سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، جیسا کہ ایک مشہور حدیث سے ثابت ہے کہ اللہ کے فرشتے ان مجلسوں کی خبر گیری کرتے ہیں، اور اللہ کے پاس گواہی دیتے ہیں کہ اس مجلس میں تیری تکبیر، تحمید، تسبیح اور بڑائی وبزرگی کا ذکر خیر ہے۔ اللہ کا ارشاد ہوتا ہے کہ میں تم لوگوں کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ان سب کو معاف کردیا ہے۔ ایک فرشتہ عرض کرتا ہے یا اللہ! وہاں ایک بندہ اس مجلس کا فرد تو نہیں ہے مگر کسی کام سے آیا تھا اور اس مجلس میں شریک ہوگیا تو اس کو بھی مغفرت کا پروانہ دیا جائے گا؟ ارشاد ہوتا ہے **ھم الجلساء لایشقی بھم جلیسھم** (صحیح البخاری، ۶۴۰۹) ''وہ ایسے ہم نشین ہیں جن کے ساتھی کو محروم نہیں کیا جاسکتا''۔

بہرحال! تعمیر سیرت میں اچھے ہم نشین کا کردار بڑا اہم ہے۔ اللہ سے دعا گوں ہوں کہ رب العالمین ہمیں کتاب وسنت کے مطابق اپنی سیرت کو سنوارنے کی توفیق نصیب فرمائے، آمین یارب العالمین۔

☆☆☆

نقطۂ نظر

سیاست اور ملک کی تعمیر میں علماء کا کردار

مولانا اسرار الحق قاسمی

دور حاضر میں جب کہ ہر طرف انارکی پھیلی ہوئی ہے اور بدعنوانی نے اپنے سیاہ سائے ہر چہار جانب پھیلا دیئے ہیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ملک کو اس صورت حال سے کیسے نجات دلائی جاسکتی ہے ۔اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ حکومت کے ذریعہ ایسے ناگفتہ بہ حالات سے چھٹکارا پایا جائے مگر اس کے لئے اچھی حکومت کی ضرورت ہے ۔مگر سوال یہ ہے کہ اچھی حکومت کیسے قائم ہوسکتی ہے ۔اس سلسلہ میں اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ حکومت میں جتنے اچھے آدمی ہوں گے، اتنی ہی حکومت اچھی ہوگی ، ایسے لوگ جنہیں اپنے مفادات کی کچھ فکر نہ ہو، جو عوام کے مسائل کے لئے ہمہ وقت فکر مند رہیں، جن کا جذبہ ملک اور عوام کو آگے لے جانے کا ہو، جو یہ چاہتے ہوں کہ ان کے ملک میں بدامنی نہ ہو اور غلط کام بھی نہ ہوں، جن کے اندر ایمانداری ، دیانت داری ہو، سچائی ہو، خلق خدا کی خدمت کا جذبہ ان کے سینوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔اگر حکومت میں ایسے لوگ ہوں گے تو وہ اپنے ملک کے آئین کا حددرجہ احترام کریں گے اور ملک کے قوانین کو نافذ کرنے میں پورا زور لگا دیں گے، وہ عوام کی پریشانی کو دیکھ کر تڑپ اٹھیں گے ، جب وہ لوگوں کو ان پڑھ دیکھیں گے تو ان کی تعلیم کا بندوبست کریں گے ،وہ یہ چاہیں گے کہ ملک کا ہر بچہ تعلیم حاصل کرے۔اس کے برعکس اگر مفاد پرست ، بے ایمان، اور غیر معیاری لوگ حکومت میں آئیں گے تو پھر انہیں خلق خدا کی فکر نہ ہوگی ، وہ تو اپنے محلات بنانے کے لئے خود بھی بدعنوانی میں ملوث ہوجائیں گے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اچھے لوگ ہی اچھی حکومت چلاسکتے ہیں تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اچھے لوگ کون ہوتے ہیں؟ ان کی اچھائی کے پہچاننے کا پیمانہ کیا ہے؟ معاشرے کے وہ کون سے افراد ہوسکتے ہیں جو خلق خدا کے لئے تڑپیں ، جو نہایت ایماندار و دیانت دار ہوں اور خدا ترس بھی ہوں، انہیں یہ احساس بھی ہو کہ اگر انہوں نے اپنی ذمہ داری کو بخوبی نہ نبھایا تو قیامت کے دن

ان کی گرفت ہوسکتی ہے۔ظاہری بات ہے کہ اس معیار پر سب سے زیادہ وہی لوگ اتر سکتے ہیں جو دیندار ہوں گے۔اس سے انکارنہیں کیا جاسکتا کہ دیندار لوگ ہی غلط کاموں سے زیادہ پرہیز کرتے ہیں۔جب بات دینداری وخداترسی کی آتی ہے تو علماء کا نام سرفہرست آتا ہے۔کیوں کہ علماء دین کو برسہابرس تک پڑھتے ہیں اور دینی تربیت بھی حاصل کرتے ہیں۔معاشرے میں ان کی شناخت دیندار کی حیثیت سے ہوتی ہے۔وہ جو کام کرتے ہیں،اس کی بابت انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کام کو بہتر طریقے سے کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اسی لئے جو علماء سیاست میں آئے انہوں نے حکومت کو بہت بہتر طریقے سے چلایا،علماء نے سیاست میں قدم رکھا تو اس میدان میں بھی انہوں نے بہترین کارنامے انجام دیئے۔تاریخ گواہ ہے کہ تحریک آزادی وطن میں علماء نے قائدانہ کردار ادا کیا تھا اور اخلاص کے ساتھ آزادی کے ہر موڑ پر نظر آئے تھے۔

انگریزی حکام علماء سے خوفزدہ تھے،کیوں کہ وہ علماء کی اپنے ملک کے لئے ایمانداری اور جوش سے واقف تھے۔1857 کی جنگ کے بعد انگریزوں نے علماء کو نشانہ بنایا تھا اور ہزاروں علماء کو پھانسی دی تھی۔شاہ عبدالعزیزؒ، مولانا ابوالکلامؒ،مولانا حسرت موہانیؒ،حضرت شیخ الہندؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ،مفتی کفایت اللہؒ،مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ جیسے علماء نے تحریک آزادی کی آبیاری کی تھی۔ آزادی کے بعد جو علماء بھی سیاست کے افق پر جلوہ گر ہوئے انہوں نے اپنے عمل اور کارہائے نمایاں سے ایسے نقوش چھوڑے جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ بن گئے۔لیکن المیہ یہ ہے کہ وقت کے ساتھ علماء کی نمائندگی حکومت میں کم ہوتی گئی۔اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ علماء آزادی کے بعد دینی کاموں میں مشغول ہوگئے،دوسری طرف بعض مفاد پرست لوگوں نے یہ ماحول بنایا کہ سیاست میں علماء کا حصہ لینا درست نہیں ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے علماء کو آگے لانے میں زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ مگر سوال یہ ہے کہ سیاست میں علماء کیوں نہیں حصہ لے سکتے؟اس کا ایک ہی جواب دیا جاتا ہے کہ علماء نیک لوگ ہوتے ہیں اور سیاست میں طرح طرح کی برائیاں ہیں، وہ ان کی شایان شان نہیں۔لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ سیاست میں گندگی کیوں آئی،سیاست بدنام کیوں ہوئی؟اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ مفاد پرست اور بے ایمان قسم کے لوگوں نے آکر سیاست میں ایسا کام کیا کہ سیاست بدنام ہوکر رہ گئی اور اسے غلیظ شے سمجھا جانے لگا۔جب کہ سچائی یہ ہے کہ بذات خود سیاست میں کوئی برائی نہیں ہے۔سیاست کی اچھائی یا برائی کی بات اس میں شامل لوگوں کے سبب ہوتی ہے۔جب اچھے لوگ سیاست میں نہیں آئیں گے تو سیاست میں صفائی کیسے ہوگی؟

تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ جب دیندار اور خداترس لوگوں نے جہاں بھی زمام حکومت سنبھالی وہاں امن وامان کی بحالی ہوئی،عوام الناس کو ہر طرح کی سہولیات دستیاب ہوئیں۔ان کے ادوار میں نہ گھوٹالے ہوئے،نہ قتل عام ہوا،نہ کرپشن پھیلا،نہ ملاوٹ

ہوئی ،نہ ظلم وزیادتی ہوئی ۔آج جب کہ حالات نہایت دگرگوں ہیں، ہرطرف انارکی پھیل چکی ہے،ظلم وزیادتی ، فحاشی اور بدعنوانی کا دوردورہ ہے تو حکومت میں ایسے لوگوں کی شدید ضرورت محسوس ہورہی ہے جو اپنے دیندارانہ وصالحانہ کردار سے ملک کے انتظام وانصرام کو بہتر بنانے کے لئے مخلصانہ جدوجہد کریں۔جہاں تک نیکی کا سوال ہےتو اس میں علماء کی ہی تخصیص نہیں ہے بلکہ جو لوگ بھی ایماندار ودیانت دار ہوں وہ سیاست میں آگے آئیں ، ملک وقوم کا درد رکھنے والے اور خدا سے ڈرنے والے دانشوان سیاست کے میدان میں آگے بڑھیں ، سیاست کی موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس سے دامن نہ بچائیں، آج ملک کی سیاست کو ان کی شدید ضرورت ہے۔یہاں تک کہ وہ غیر مسلم افراد جو انسانیت میں یقین رکھتے ہیں اور ملک وقوم کے لئے مخلص وسچے ہیں انہیں بھی آگے آنا چاہئے ۔عوام کو بھی چاہئے کہ وہ ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کریں جو واقعی بہترین انسان ہیں، دیانتدار وایماندار ہیں، یہ کہہ کر ان کی حوصلہ شکنی نہ کریں کہ سیاست ان کے لئے نہیں ہے۔اچھے لوگوں کی سیاست میں شمولیت کی حوصلہ افزائی کا مطلب ہوگا ملک کو تابناک مستقبل کی طرف لے جانا۔

اگر ہم اپنے ملک کی صورت حال پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ملک میں بدعنوانی پھیلی ہوئی ہے، جرائم کا بازار گرم ہے،عوام الناس مسائل کے شکار ہیں، ہر شعبے میں رشوت کے واقعات سامنے آتے ہیں۔حکومت اگر انہیں روکنے کی کوشش بھی کرتی ہےتو اسے اس لئے پوری کامیابی نہیں مل پاتی ہے کہ بہت سے سیاست داں خود اپنے مفادات کی خاطر بدعنوانی، رشوت خوری وغیرہ کے خاتمہ کی سنجیدہ کوششیں نہیں کرتے بلکہ کتنے تو خود ملوث ہوجاتے ہیں۔جب کہ خداترس لوگ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور وہ بدعنوانی، رشوت خوری اور دیگر غلط کاموں میں ملوث نہیں ہوتے۔مفاد اور تعیش پسند لیڈران کے اسکینڈل ہی سامنے آتے ہیں ، بہت سے شراب پیتے ہیں،حکومت کے اثاثے میں خرد برد کرتے ہیں اور اپنے عوام کے مسائل کو حل کرنے کے لئے فکرمند نہیں ہوتے۔ایک عالم دین نہ شراب پی سکتا ہے، نہ فحاشی میں مبتلا ہوسکتا ہے، نہ رشوت لے سکتا ہے، نہ گھوٹالے کرسکتا ہے، اور نہ ہی حرام وناجائز کاموں کا ارتکاب کرسکتا ہے۔ وہ چاہے کتنے بڑے عہدے پر فائز ہوجائے ،وہ کتنا بڑا وزیر بن جائے ،وہ کتنا بڑا قائد بن جائے ، وہ ہر اوچھی حرکت سے بچا رہے گا۔مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ،مولانا ابوالکلام آزاد جیسے کتنے علماء آزادی کے بعد بھی حکومت کے کاموں میں سرگرم رہے، انہیں حکومت نے اہم مقامات دیئے مگر کسی بھی عالم نے کوئی اوچھی حرکت نہیں کی ،اپنے عہدے کا غلط استعمال نہیں کیا، انہوں نے اپنی ایمانداری اور کاموں سے ملک اور اپنے اپنے علاقوں کے وقار کو بلند کیا۔آج جب کہ سیاست اپنے معیار سے گرگئی ہے تو اس کی تطہیر کے لئے علماء اوران جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

نقطۂ نظر

عصر حاضر میں تعلیمات نبوی کی معنویت

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی
نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ

اللہ رب العزت نے جب سے یہ دنیا قائم کی، پہلے دن سے ہی انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے انبیاء و رسل کو مبعوث کرنا شروع کیا، بلکہ جب اس دنیا میں کوئی انسان نہیں تھا صرف آدم علیہ السلام تھے، اس ایک انسان کو نبی بنایا، دنیا آباد ہوتی گئی، آبادیاں بڑھتی رہیں، کائنات کا نظام وسیع ہوتا رہا اور اس وسعت کے حساب سے انبیاء و رسل بھیجے جاتے رہے، تاریخ میں ایسے مواقع بھی آئے جب مختلف علاقوں کے لئے الگ الگ رسول بھیجے گئے تاکہ وہ احکام الٰہی کو لوگوں تک پہنچائیں، خود کر کے دکھائیں، اور وہ لوگوں کے لیے آئیڈیل ہوں، یہ احکام الٰہی آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ بھی رہیں، اس لئے آسمانی کتابیں اور صحیفے بھیجے گئے، ضرورت کے اعتبار سے یک بارگی یا قسطوں میں، پھر ایک دور وہ آیا جب خالق کائنات نے اپنے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بنا کر مبعوث کیا، کتاب اللہ کی شکل میں تیئس سال میں قرآن کریم کو قیامت تک کے لئے دستور حیات بنا کر نازل کیا اور عالم الغیب اور علیم بذات الصدور نے اس پورے نظام کی تکمیل کا اعلان کر دیا، اور نعمت باری کے اتمام کا مژدہ سنا دیا، رعایت قیامت تک آنے والے لوگوں کی ملحوظ رکھی گئی اور قرآن کریم کو قیامت تک کے لئے تحریف وتبدیل سے محفوظ رکھنے کا وعدہ کیا گیا۔ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو جامع کمالات اور صفات کے ساتھ جوامع الکلم بنایا گیا اور ملفوظات نبوی بھی دین کا حصہ قرار پائے، زبان نبوت سے یہ اعلان بھی کروا دیا گیا کہ زبان مبارک سے نکلنے والے کلمات وملفوظات بھی وحی الٰہی سے ہی صادر ہوتے ہیں اور معاملہ صرف اتنا سا ہے کہ ان کی قرآن کریم کی طرح تلاوت نہیں کی جاتی۔ اب یہ ساری تعلیمات قرآن و احادیث میں مذکور اور محفوظ ہیں ان تعلیمات کی اہمیت اور ضرورت ہر دور میں رہی ہے اور اس نے ہر دور میں بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لانے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ جب جب ان تعلیمات سے انسانوں نے دوری اختیار کی، انسانیت کراہنے اور سسکنے

لگی، انسانوں کے خود ساختہ دستور، قوانین اور نظام زندگی نے بنی نوع انسان کوسکون، راحت وآرام پہونچانے کے بجائے اسے نت نئے مسائل اور پریشانیوں سے دوچار کیا، موجودہ دور اس کی منہ بولتی تصویر اور عصر حاضر کے مسائل ومشکلات اس کی واضح مثالیں ہیں، ہر طرف افراتفری اور افراط وتفریط کی گرم بازاری ہمیں تعلیمات نبوی پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کررہی ہے، یہی ایک صورت ہے جس میں پریشان دنیا کا مداوا ہے۔ہم نے ایک کے سامنے سر کو جھکانا چھوڑ دیا تو پتہ نہیں کتنی جگہوں پر جبیں سائی کرنی پڑ رہی ہے۔ہمیں ’’یک درگیر ومحکم گیر،، کا حکم دیا گیا تھا ہم نے بہت سارے دروازوں سے اپنی امیدیں اور توقعات وابستہ کرلیں، نتیجہ میں ہمیں ہلاکت وبربادی ، افلاس وپسماندگی ملی، ہمیں غصہ پر قابو پانے کا حکم دیا گیا تھا اور جو اسے پچھاڑ دے اس کے قوی ہونے کا اعلان کیا گیا تھا، ہم اس معاملہ میں اتنے کمزور ثابت ہورہے ہیں کہ ہماری شبیہ جذباتی اور جوشیلی بن گئی ہے، تحمل اور برداشت کا مادہ ہم میں باقی نہیں ہے، جس کے مضر اثرات کھلی آنکھوں ہم دیکھ سکتے ہیں، ہمیں غیبت ، چغل خوری، تجسس، ذات برادری کی لعنت سے دور رہنے اور ہر قسم کے تعصب سے پاک سماج بنانے کی ذمہ داری دی گئی تھی ،لیکن ہم اس پوری لعنت کو ترقی اور رفع درجات کا ذریعہ سمجھنے لگے، اس کے لئے تنظیمیں بنائی جانے لگیں، اور ہم آپس میں دست وگریباں ہونے لگے، دھوکہ دہی مسلمانوں کے شایان شان نہیں تھی لیکن مادی منفعت کے حصول کی ہوس میں یہ شان جاتی رہی ، اب پھٹے کپڑے اور خراب مال کو اچھا کہہ کر اچھی قیمت پر فروخت کردینے والا ہی اچھا سلز مین ہے، گول مرچ میں پپیتے کا بیج اور مرچ کے سفوف میں اینٹ کے سفوف ملانے کے واقعات بھی حیرت انگیز نہیں ہیں، لوگوں پر رحم کرنے والے پر اللہ کی رحمت کے نزول کی بشارت دی گئی تھی، لیکن ظلم وجور ہمارا شیوہ بن گیا، علم ہماری شناخت کا ذریعہ تھا، ہم جہالت میں ممتاز ہوکر رہ گئے، اللہ کا خوف باقی نہیں ہے۔ہمیں امت وسط اور خیر امت بنا کر لوگوں کو صحیح راستے پر لانے کا کام سپرد کیا گیا تھا، ہم خود گم کردہ راہ ہوگئے ، راہ بری کس طرح کرسکتے ہیں،، سود کی لعنت سے پاک تجارت اور معاشی نظام ہماری پہچان تھی ، لیکن ہمیں سودی کاروبار کرنے تک میں عار نہیں ہے، کوششیں اس کی بھی ہوتی رہتی ہیں کہ کسی نہ کسی بہانے ہندستان میں سود کو جائز قرار دیدیا جائے، ہمیں والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انہیں اف تک کہنے سے روکا گیا تھا، ان کے لئے اپنے کاندھے جھکا دینے کا حکم دیا گیا اور ہم ان کے لئے اولڈ ایج ہوم کی تجویز لا رہے ہیں، تاکہ ہماری بے لگام زندگی میں وہ کہیں پر رکاوٹ نہ بنیں، ہمیں اپنی نگاہ نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا تھا، عورتوں کو بے پردہ نکلنے اور بناؤ سنگھار کر کے غیروں کے سامنے آنے سے منع کیا گیا تھا، ہم نے ان حدود وقیود کو اس طرح توڑا کہ رشتوں کا احترام باقی نہیں رہا، ہمیں ام الخبائث شراب کی حرمت بتائی گئی تھی کہ اس میں گناہ بڑا ہے ہم نے اس کو شیر مادر سمجھ کر استعمال کرنا شروع کردیا، جوئے ، قمار سے ہمیں

روکا گیا تھا،لیکن ہم نے اسے جلد مالدار ہونے کا نسخہ سمجھ لیا، اب جوئے خانے کے لائسنس دیئے جاتے ہیں اور گھوڑ دوڑ کے مقابلے میں کھلے عام جوا کھیلا جاتا ہے ،ہمیں اسراف وفضول خرچی سے منع کیا گیا تھا اور فضول خرچی کرنے والے کوشیطان کا بھائی قرار دیا گیا تھا، ہم مختلف تقریبات میں ہزاروں روپے کے پٹاخے پھوڑ رہے ہیں، دو دو سو روپے کے شادی کارڈ چھپوا رہے ہیں، اور کئی کئی سو بلکہ ہزار ہزار روپے کی پلیٹوں پر دعوت ولیمہ کررہے ہیں، بینڈ باجے، رقص وسرور، ڈکوریشن اور استقبالیہ کے نام پر جو تماشے ہم کررہے ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں، انسانی اعضا کی تجارت کو حرام قرار دیا گیا تھا ہم پورے کے پورے سالم جوان لڑکے کو تجارت کا مال سمجھ بیٹھے ہیں، لڑکی والوں پر شادی میں کوئی مالی بوجھ نہیں ڈالا گیا تھا ہم تلک وجہیز کے ساتھ کھانے تک کے مینو طے کرنے میں لگے ہیں، ہمیں مہر دینے کا حکم دیا گیا تھا، ہم نے اسے دین مہر بنا دیا، ہم نے اسلامی تعلیم کو چھوڑا تو خاندان ٹوٹنے لگا۔ ہمیں پورے خاندان کا نگراں بنایا گیا تھا اور اس حوالے سے ہماری باز پرس بھی ہونی ہے، لیکن ہمیں کلبوں، تفریح گاہوں، سنیما گھروں اور دوستوں کی مجلسوں سے فرصت ہی نہیں کہ ہم اپنے گھر، خاندان اور بچوں کی نگرانی اور تعلیم وتربیت کا خیال رکھ سکیں، پاکیزہ زندگی گزارنا ہمارا طرۂ امتیاز تھا، آج اس کا خیال تک قصہ پارینہ ہے، اس لئے عصر حاضر میں تعلیمات نبوی پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے کہ ہم اس سے بہت دور ہوگئے ہیں، اور ہم کا مطلب صرف مسلمان نہیں ہیں تمام انسان ہیں اس لئے کہ تمام لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے، اللہ تمام جہان کا رب، رسول تمام جہان کے رسول اور قرآن کریم تمام جہان کی ہدایت کے لئے ہے، فرق صرف یہ ہے کہ جس نے اس دعوت کو قبول کرلیا ہے اس پر سارے احکام لاگو ہوتے ہیں اور جو ابھی ایمان نہیں لائے ان پر پہلے ایمان لانا اور پھر تمام احکام پر عمل کرنا ضروری ہے، جو لوگ بغیر ایمان لائے بھی تعلیمات نبوی کے دوسرے حصوں کو اپنی زندگی کا محور بنائیں گے وہ بھی دنیا میں اس کے فوائد وبرکات سے مستفید ہوسکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے پیروکار بھی اس قسم کی آواز لگاتے رہتے ہیں کہ حکومت کرنی ہے تو اس کا طریقہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ سے سیکھو اور انسانی ہمدردی اور اکرام انسانیت کا درس اسلام سے حاصل کرو۔ آیئے ہم پھر تعلیمات نبوی کی طرف لوٹ چلیں، اپنی زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گذاریں، اور نفس کے شر سے بچا کر اپنے اور اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچائیں، جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے اور جن پر مامور فرشتے صرف اللہ کی مانتے ہیں، ان کی نافرمانی نہیں کرتے، اور جو حکم ہوتا ہے کرگذرتے ہیں۔ **لا یعصون اللہ ماامرھم ویفعلون مایؤمرون.**

☆☆☆

تجزیہ

دور حاضر کی چند اصلاحی تحریکیں

ظلمت میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

وہ مثالی عہد جسے خیر القرون کہا گیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے، اس کے بعد خلفائے راشدین کا عہد ہے۔ اس پورے عہد میں اسلام کا سورج درخشاں تھا، عبادت اور روحانیت اور اخلاقی قدروں سے لے کر حکومت اور اقتدار اور غلبہ واستیلا، یعنی اسلام کا پورا نظام کارآفریں اور کارگر تھا۔ اسلام کا پورا نظام حیات کامل شکل میں بعد کی صدیوں میں باقی رہا، اسلام کے چمن میں پھول کھل رہے تھے لیکن بہت سے غنچے ناشگفتہ رہ جاتے ہیں۔ پھولوں کے ساتھ کہیں کارزار بھی نمودار ہو جاتے تھے۔ اسلام کے نظام حیات میں جہاں جہاں کمی تھی اسے درست کرنے کی کوشش بھی ہر عہد میں جاری رہی۔ عباد وزہاد اپنی عبادتوں میں اور تزکیہ نفس کی کوششوں میں مشغول رہے تھے اور روحانیت کی شمع روشن کر رہے تھے لیکن انہیں بھی اس بات کا علم تھا کہ اسلام کے کامل اجتماعی نظام کا مطلب کیا ہے۔ ان کے بس میں جو تھا اس سے انھوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اسلام کی پوری تاریخ میں دعوت واصلاح اور جہاد اور انقلاب اور تدوین علوم کی مختلف اقدار کی کوششیں جاری رہیں اور کسی عہد میں بھی ایسا خلا نہیں پایا گیا جس میں کسی نے چراغ جلا نے اور اور اندھیرے کو مٹانے کی کوشش نہ کی ہو۔ مجاہدین اور مجددین اور مصلحین سے کوئی زمانہ خالی نہ رہا۔

دور حاضر یعنی بیسویں صدی کا جائزہ لیا جائے اور اِس دور کی اصلاحی تحریکات کا ذکر کیا جائے تو پس منظر کے طور پر عرب دنیا کے محمد بن عبدالوہاب کی تحریک اور ہندستان میں سید احمد شہید کا ذکر مناسب ہوگا۔ محمد بن عبدالوہاب (۱۱۱۵-۱۲۰۶) کی تحریک خلافت عثمانیہ کے دور کی پہلی اسلامی تحریک ہے یہ تحریک مرکز سوات یعنی جزیرۃ العرب میں پروان چڑھی۔ یہ تحریک انیسویں صدی کے اواخر کی تحریک ہے۔ انھوں نے اپنے والد شیخ عبدالوہاب سے فقہ حنبلی پڑھی مدینہ، مکہ، بغداد، بصرہ اور اصفہان کے علماء سے استفادہ کیا۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی اصلاحی تحریک کا مرکزی نکتہ اور محور توحید ہے۔ انھوں نے بدعات کے

خلاف پورے شدومد سے تحریک چلائی اورتوحید خالص کو پیش کیا،مشرکانہ عقائد کی نفی کی۔انھوں نے معاشرہ میں پھیلی ہوئی بدعتوں اورقبر پرستی پرنکیر کی اورلوگوں کواس سے روکا۔ان کی اصل دعوت تصحیح عقائد کی دعوت ہے۔انھوں نے صحیح عقائد کی اشاعت کے لیے اہل بدعات سے جنگیں بھی کیں۔اور جب شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت پھیلی تو امیر محمد بن سعود کے دل کو اللہ نے اس کی طرف متوجہ کیا اورانھوں نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے ہاتھ پر بیعت کرلی اوراس طرح اس دعوت کو سیاسی اقتدار بھی حاصل ہوگیا لیکن شیخ نے نظام خلافت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ طرز ملوکیت پر راضی ہوگئے۔انھوں نے اسی حدتک حکمت کے ساتھ اصلاحی کام کیا جس حد تک حالات اجازت دیتے تھے۔اگر وہ امیروں سے برسرپیکارہوجاتے اورملوکیت کے خاتمہ کا مطالبہ کرتے تو ان کی اتنی بھی کامیابی نہیں ہوتی جتنی کہ انہیں حاصل ہوئی ، اسلام کا سیاسی نظام پورے طور پر برسرعمل نہ آسکا،شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تصانیف بے شمار ہیں۔ان کا کار تجدید ایک دائرہ کےاندر محدود ہے۔

جس طرح بیسویں صدی کی تحریک کے پس منظر میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کاذکرکیا گیااسی طرح سے ہندستان میں اس سے ملتی جلتی ایک تحریک اٹھی یہ سیداحمد شہید کی تحریک تھی جو اس ملک میں اسلام کی بقاء کے لیے، بدعات اورخرافات کا قلع قمع کرنے کے لیے، غیر ملکی اقتدار کوختم کرنے کے لیے، سکھوں کےظلم اوراستبداد سے مسلمانوں کونجات دلانے کے لیے اور امارت اور خلافت کے احیاء کے لیے اٹھی تھی۔سید احمد شہید کے مریدین ومعتقدین اور خلفاء پورے ملک میں پھیل گئے تھے اور انھوں نے اسلامی تعلیمات وعقائد کی اشاعت کی۔جس وقت یہ تحریک اٹھی تھی مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہورہی تھی۔پنجاب میں سکھوں کا قبضہ تھااور باقی ہندستان میں انگریزوں کا۔معاشرہ خرافات اور بدعات کا گہوارہ تھا۔سید احمد شہید نے ہرمحاذ پر کام کیا اورتجدید و اصلاح کاعظیم کام انجام دیا۔لاکھوں لوگوں کوتوبہ کی توفیق ہوئی اور ہزاروں اسلام میں داخل بھی ہوئے۔ان سب کے ساتھ انھوں نے امارت اورخلافت کا احیاء بھی کیا۔ لوگ ان کوسید بادشاہ اورامیر المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین کے نام سے یادکرتے تھے۔لیکن تجدید کا یہ پیامبر سکھوں سے جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہوگیا۔ سید احمد شہید اور محمد بن عبد الوہاب دونوں کی تحریکیں انیسویں صدی کی تحریکیں تھیں اوردونوں تحریکوں نے مسلمانوں پر بہت گہرااثر ڈالا۔

بیسویں صدی کا سورج طلوع ہوتاہےتو اسلامی دنیا کے افق پرسنوسی تحریک اصلاح وانقلاب بردوش نظرآتی ہے، یہ وقت تھا جب خلافت عثمانیہ زوال سے دوچار تھی اورترکی کا مرد بیمار نزع کے عالم میں گرفتار تھا،مغربی استعمار نے اپنے خونی پنجے عالم اسلام کے بدن میں گاڑنے شروع کردیے تھے۔اس تحریک نے اطالوی استعمار کا مقابلہ کیا اوراسلامی معاشرہ میں صحیح روح پیدا کرنے کی جدوجہد کی۔مذہب اور

سیاست دونوں کو بہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس تحریک کے بانی محمد بن علی ابن سنوسی تھے۔ انھوں نے مغربی نظام اقتدار کے مقابلہ میں اسلام کے دینی اور اخلاقی اقدار کو معاشرہ میں مؤثر طریقہ سے اجاگر کیا۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو ایک طرف روحانیت اور پاکیزگی کی غذا عطا کی اور دوسری طرف انہیں جہاد کے جذبہ سے لبریز کیا اور پرجوش کیا۔ سنوسی تحریک کے پاس اسلام کا یک انقلابی تصو رتھا۔ وہ تصور تھا جس میں جہاد بھی تھا اور عبادت اور روحانیت بھی۔ جہاد اس لیے ضروری تھا کہ فرانس نے الجزائر اور تیونس پر قبضہ کی کوشش کی تھی۔ بعد میں مصر پر پہلے فرانس کا اور برطانیہ کا تسلط ہوگیا تھا۔ اٹلی طرابلس (لیبیا) پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ محمد بن علی سنوسی نے حجاز سے افریقہ تک اصلاحی مراکز کا جال بچھادیا۔ ان میں سے ہر مرکز خانقاہ بھی، تربیت گاہ بھی، تعلیم گاہ بھی تھا اور یہاں جہاد کی تیاری بھی ہوتی تھی، ان میں سے ہر مرکز کو زاویہ کہتے تھے، عربی میں زاویہ خانقاہ کو کہتے ہیں۔ اس سنوسی تحریک کی طرف سے الجزائر کو مالی امداد بھی بھیجی گئی اور مجاہدین بھی بھیجے گئے تاکہ فرانسیسی فوجوں کا مقابلہ کیا جاسکے۔ مرکزی حیثیت زاویہ بیضاء کو اور پھر زاویہ جعفوب کو حاصل ہوئی جہاں ازہر کے طرز پر تعلیم دی جاتی تھی۔ ہر زاویہ میں ایک مہمان خانہ ہوتا تھا، معلمین کے رہنے کی جگہ ہوتی تھی، تعلیم وارشاد کے لیے ہال ہوتے تھے، مسجد ہوتی تھی اور مدرسہ قرآنیہ ہوتا تھا۔ اس تحریک کو اطالوی فوجوں کا مقابلہ کرنے میں قوت کا بڑا حصہ صرف کرنا پڑا۔ اس تحریک نے ایک اجتماعی کیفیت پیدا کردی تھی ان مراکز کی تعداد ۱۰۲ تھی جو طرابلس سے لے کر سوڈان اور الجزائر تک پھیلے ہوتے تھے، یہ تحریک اقامت دین کے مقصد کے لیے تھی۔

سنوسی تحریک کی بڑی طاقت اٹلی کی فوجوں سے جہاد میں صرف ہوئی۔ اس نے جہاد کی اسپرٹ پیدا کی اور مسلم معاشرہ بھی قائم کیا لیکن یہ تحریک کوئی فکر انگیز لٹریچر نہیں تیار کرسکی۔ استعمار کی غلامی سے نجات پانے کے بعد یہ تحریک باقی نہیں رہی اور اس تحریک سے کوئی بڑا فکری انقلاب پیدا نہیں ہوسکا یعنی وہ انقلاب جو مغربی تہذیب اور فوج کا مقابلہ کرسکے اور اسلامی اصولوں پر حکومت قائم کرسکے۔

معیار اور نمونہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد ہے اور اس کے بعد خلفائے راشدین کا عہد۔ جو اصلاحی اور تجدیدی کام نتیجہ کے اعتبار سے انفرادی زندگی میں اور اجتماعی زندگی میں وہ انقلاب پیدا کردے گا جو اس معیار سے قریب تر ہو اس کے کام کو اسی درجہ میں کامیاب اور فتح یاب قرار دیا جائے گا۔ ایسی جامع المجد دین قسم کی شخصیت شاذ ونادر پیدا ہوتی ہے لیکن دو چار پہلو کے اعتبار سے جو اسلامی زندگی کو دوبارہ واپس لے آتا ہے وہ بھی مجدد ہوتا ہے۔ سنوسی تحریک نے معاشرہ میں برائیوں کو ختم کیا لوگوں کو عبادت کے کاموں اور نیکی کی طرف راغب کیا، بیرونی استعمار کا مقابلہ کیا اس لیے وہ بڑا اصلاحی اور تجدیدی کام ہے لیکن استعمار سے رہائی دلانے کے بعد لیبیا میں جو حکومت قائم ہوئی وہ ملوکیت تھی خلافت کے طرز کی حکومت نہ تھی۔ اسی طرح سے محمد بن عبد الوہاب کی اصلاحی تحریک سے خلافت قائم نہ ہوسکی۔

انھوں نے ملوکیت کے نظام سے سمجھوتہ کرلیا۔

عرب دنیا کی ایک اور تحریک جس نے فکری انقلاب برپا کیا وہ جمال الدین افغانی کی تحریک تھی وہ افغانستان میں پیدا ہوئے لیکن وہ جہاں گئے وہاں لوگ ان کے انقلاب آفریں خیالات سے متاثر ہوئے۔ ان کی آواز صداء اسرافیل تھی، ان کا قلم تیغ اصل تھا، ان کی صدا استعمار کے لیے بانگ رحیل تھی، وہ خود ایک شہاب ثاقب تھے، وہ ایک شعلہ جوالہ تھے، ان کی زندگی اسلامی روح کا مظہر تھی، وہ جہاں گئے انھوں نے اپنا ایک حلقہ بنالیا اور لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کیا۔ ان کا مقصد ایسی اسلامی حکومت کا قیام تھا جس کی برکات دور دور پہونچیں۔ شیخ محمد عبدہ، شیخ عبدالقادر الجزائری، امیر شکیب ارسلان، شیخ رشید رضا اور بے شمار مصلحین نے اپنے چراغ کو ان کے چراغ سے روشن کیا۔ صرف عوام نہیں حکومتیں ان سے متاثر ہوئیں، بہت سی حکومتیں ان کے خیالات سے خائف بھی رہتی تھیں۔ شیخ جمال الدین افغانی پہلے عوام کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ جمال الدین افغانی کے خیالات وافکار کئی نسلوں تک منتقل ہوتے رہے، یہاں تک کہ حسن البنا کی شخصیت اور ان کی تحریک الاخوان المسلمون کو بھی جمال الدین افغانی کی تحریک کا تسلسل قرار دیا جاسکتا ہے۔ جمال الدین افغانی نے پیرس سے العروۃ الوثقی کے نام سے رسالہ بھی نکالا اور اس کے ذریعہ سے مسلم ملکوں میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ مسلم حکومتوں کو متحد کرنا چاہتے تھے اور مغربی استعمار کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ شاہ ایران نے ان کو دعوت دی اور اس نے ان کو وزیر اعظم بنانا چاہا لیکن ان کے سیاسی خیالات سے اور جمہوریت اور شورائیت کے ذریعہ حکومت چلانے کی دعوت سے شاہ ایران ڈر گیا۔ وہ جب مصر میں تھے وہاں بھی انھوں نے شورائی نظام کی دعوت دی۔ انگریز ان سے خائف ہوئے اور خدیو توفیق پر دباؤ ڈال کر ان کو مصر سے نکلوادیا۔

جمال الدین افغانی کے تلامذہ میں سب سے ممتاز مفتی محمد عبدہ ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی فکری شاہ راہ جمال الدین افغانی سے الگ کرلی۔ سیاسی انقلاب جمال الدین افغانی کا مطمح نظر تھا۔ لیکن استعمار کی گرفت اتنی سخت تھی کہ شیخ محمد عبدہ کو صرف دینی تربیتی اور تعلیمی انقلاب تک خود کو محدود کرنا پڑا اور انھوں نے تفسیر قرآن، اصلاح عقائد، دینی تعلیم پر ارتکاز کرلی۔ انھوں نے انگریزوں سے مصالحت کرلی۔ ان کے لیے جمال الدین افغانی کی پالیسی پر گامزن ہونا مشکل ہوگیا، شیخ عبدہ کی شخصیت کی تسکین جمال الدین افغانی کی مردم ساز اور انقلاب آفریں شخصیت کا بڑا حصہ ہے۔ لیکن بعد میں شیخ محمد عبدہ نے اپنی راہ الگ نکالی اور اپنی انفرادیت کا سکہ جمایا۔ انھوں نے ایک طرف تقلید جامد اور روایتی ذہن کا مقابلہ کیا دوسری طرف تجدد پسندی کے ذہن کی مزاحمت کی۔ ان کا خیال تھا کہ دین سے ناواقفیت نے مسلمانوں کے اخلاق کو بگاڑ دیا ہے اور اس کا علاج صحیح دینی تعلیم ہے۔ شیخ محمد عبدہ اسلامی عقائد کی تعلیم کے ساتھ فقہ کو اقتضاء زمانہ کے مطابق بنانا چاہتے تھے، اجتہاد کا دروازہ کھولنا چاہتے تھے اور ازہر کی اصلاح چاہتے تھے۔

لیکن ازہر کے نصاب کی اصلاح آسان نہ تھی جس طرح ہندستان میں درس نظامیہ کے مدرسے کسی تبدیلی کے روادار نہیں ہیں ازہر میں بھی جمود پسند علماء تبدیلی کے روادار نہ تھے۔ شیخ دینی اور دنیوی علوم میں توافق پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن علماء اس کے حامی نہ تھے۔ شیخ محمد عبدہ کی بہت سی کوششیں جمال الدین افغانی کی کوششوں کا نتیجہ اور تکملہ ہیں، ان میں سے ایک کوشش زبان وبیان اور اسلوب کی اصلاح ہے، عربی زبان وادب میں مسجّع اور مقفی عبارتوں کا رواج تھا شیخ عبدہ سادہ اور سلیس اسلوب پسند کرتے تھے۔

اعرابی پاشا کی بغاوت اور اس میں ناکامی کے بعد شیخ عبدہ سیاست سے کنارہ کش ہوگئے۔ یہ وہی راستہ ہے جسے ہندستان میں سرسید کو اختیار کرنا پڑا۔ شیخ جمال الدین افغانی کا نقطہ نظر اور تھا لیکن ان کے شاگرد شیخ محمد عبدہ کو اپنا راستہ الگ اختیار کرنا پڑا۔ شیخ فرانسیسی زبان سے واقف تھے اہل مغرب کے علمی تصورات سے بھی واقف تھے۔

جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کے افکار کی کہکشاں کا ایک جگمگاتا ہوا ستارہ شیخ رشید رضا تھے۔ رسالہ المنار اور تفسیر کے ذریعہ اس حلقہ کے خیالات کی عام اشاعت ہوتی تھی اور اس نے دانشوروں کا ایک حلقہ پیدا کردیا تھا۔ اس تحریک کے مقاصد میں مسلمانوں کو توہم پرستی اور بدعات وخرافات سے نجات دلانا اور اسلام کی روشنی میں عصر جدید کے تقاضوں کو سمجھنا تھا اور اسلامی نظام قائم کرنا تھا اور جدید عصری مسائل پر غور کرنا تھا اور مستشرقین کے الزامات کا جواب دینا تھا۔ شیخ رشید رضا امام غزالی کی احیاء العلوم سے اور پھر العروۃ الوثقی سے جزوی طور پر متاثر ہوئے، العروۃ الوثقی کے بند ہونے کے بعد انہوں نے ''المنار'' نکالا اور جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کے پیغام کو عام کیا۔ رشید رضا کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے ترکی کی خلافت کی حمایت کی اور عرب قوم پرستی کی شدید مخالفت کی جس کا بیج انگریزوں نے بویا تھا اور ترکوں کے مظالم کا ہوا کھڑا کیا تھا۔ انھوں نے سلف کے افکار پر عمل کرنے پر بھی زور دیا اس لیے ان کی تحریک کو سلفیت کی تحریک بھی کہا جاتا ہے۔ رشید رضا شروع میں امام غزالی سے متاثر ہوئے اور بعد میں ابن تیمیہ سے۔

سرزمین عرب کی سب سے زیادہ بڑی ہمہ گیر اسلامی تحریک جو بیسویں صدی میں اٹھی اور ہر طرف چھا گئی وہ الاخوان المسلمون کی تحریک ہے۔ عقیدہ عبادات سے لے کر اقتصاد وسیاست جسمانی اور روحانی تربیت یعنی مکمل اسلام کی نمائندگی کرنے والی یہ تنظیم ہے۔ اس سے زیادہ جامع اس سے زیادہ وسیع اور اس سے زیادہ ہمہ گیر کوئی تحریک عالم اسلام میں نہیں اٹھی۔ جغرافیائی لحاظ سے اس کی وسعت کا حال یہ تھا کہ ۷۲ ملکوں میں اس کی شاخیں اور دس کروڑ اس کے ممبران کی تعداد ہے۔ اس تحریک کے لوگوں نے ۸۰ سال سے دین کے لیے قربانیاں دی ہیں اور قربانیوں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ لوگوں کو پھانسی بھی دی گئی اور جیلوں میں ڈالا گیا اور جیلوں میں ان کو سخت ایذائیں پہونچائی گئی اور ظلم اور ناانصافی کا ہر حربہ ان پر آزمایا گیا اور وہ ثابت قدم رہے، مولانا علی میاں نے ان

کے بارے میں یہ جملہ لکھا ہے ''لایحبھم الامؤمن ولایبغضم الامنافق'' یعنی ان سے صرف مؤمن ہی محبت کرے گا اور صرف منافق ہی ان سے بغض رکھے گا۔ آج دیکھنے والی آنکھیں اہل ایمان کو بھی پہچانتی ہیں اور منافقین کو بھی۔ مولانا علی میاں نے اخوانیوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور تحریک کے بانی حسن البناء شہید کے والد سے ملاقات کی تھی، اب تک جن لوگوں نے اخوان کی تحریک کا مطالعہ کیا اور قریب سے ان کے قائدین اور اراکین کو دیکھا ہے ان سب کا خیال ہے کہ بیسویں صدی میں اس سے بڑی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تحریک دنیائے اسلام میں نہیں اٹھی، یہ تحریک ایک سیل رواں کی طرح ہے جو بنجر زمینوں کو سیراب کرتی ہوئی، نخلستانوں کو شاداب کرتی ہوئی، مختلف عرب ملکوں کے شہروں اور صحراؤں سے گذری۔ مصر، شام، عراق، سوڈان، یمن، الجزائر، اردن ہر جگہ اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔ اخوانیوں کے قلم سے عظیم الشان لٹریچر وجود میں آیا۔ مصر وشام وعراق کے بے دین اور اباحیت پسند ادیبوں کا اگر کسی نے مقابلہ کیا تو اخوان کے ادیبوں نے کیا۔ ایک طویل عرصہ کی جدوجہد اور قربانیوں کے نتیجہ میں عرب دنیا میں انقلابات کی جو لہر اٹھی اس نے کئی ملکوں میں اخوان کو اقتدار کے قریب پہونچا دیا لیکن دنیا کی بڑی طاقتوں کے لیے اور اسرائیل کے لیے یہ ایک خطرناک طوفان تھا۔ چنانچہ سازش کے ذریعہ اس حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا جو جمہوری اور دستوری طور پر برسر اقتدار آئی تھی۔ اور اس کھیل میں کچھ خلیجی ممالک بھی شریک تھے جنھیں حرمین کی وجہ سے تقدس کا مقام حاصل ہے، اب مسلمانوں کی نئی نسل نے آئینہ ایام میں ان چہروں کو پہچان لیا ہے جس پر تقدس کا غازہ لگا ہوا ہے۔ اب وہ دن دور نہیں جب ان کے خلاف بھی بغاوت شروع ہو جائے گی۔

اخوان کی تحریک کے بانی شیخ حسن البناء تھے جنھوں نے ۱۹۲۸ سے ۱۹۴۸ تک کے بیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کو اسلامی جوش سے سرشار کردیا اور ایسی مضبوط اور متحدہ جماعت تیار کی جس نے امت مسلمہ کو بیدار کرنے، متحد کرنے اور ان کے اندر دین اور روحانیت کی روح پھونکنے کی زبردست کوشش کی اور مغربی تہذیب کا مقابلہ بھی کیا۔

شیخ حسن البناء جو تحریک اخوان المسلمین کے بانی تھے، خداداد صلاحیتوں سے مالا مال تھے، انھیں اپنی دعوت اور تحریک سے غیر معمولی شغف تھا۔ اس تحریک میں ان کی فنائیت تھی، مقصد سے عشق کامیابی کی شاہ کلید ہوتی ہے، ان کو مقصد سے ایسا عشق تھا جیسا کسی کو کسی پیکر جمال سے ہوسکتا ہے۔ مزید یہ کہ تربیت اور مردم سازی کے کام میں ان کو غیر معمولی قابلیت حاصل تھی۔ تصوف میں طریق شاذلیہ سے ان کا تعلق تھا۔ وہ ایک پوری قوم کے مربی تھے۔ انھوں نے پوری ایک نسل تیار کی جو مغربی تہذیب اور حیا سوز کلچر کا مقابلہ کرسکے، انھوں نے لکھنے والے اصحاب قلم ادیبوں کی ایک پوری ٹیم تیار کردی۔ انھوں نے 1951 میں جام شہادت نوش کیا جب کہ اس وقت ان کی عمر صرف بیالیس سال کی تھی۔ اس عمر میں اسلام کے لیے فداکاروں کی ایک جماعت پیدا کی جو دار ورسن کی آزمائش میں بھی ثابت قدم رہے۔ اور

جب یہ جماعت اپنی ملک گیر مقبولیت کی وجہ سے اقتدار پر فائز ہوئی تو دنیا کے سپر پاور کو خطرہ ہوا کہ مستقبل میں اسرائیل کا وجود خطرہ میں ہے، چنانچہ سازش کے ذریعہ حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا۔ اس طرح کی کارروائیوں سے تحریکیں ختم نہیں ہوتی ہیں اور نہ نقوش مٹائے جاسکتے ہیں۔ احتجاج کا سلسلہ جاری ہے۔ قربانیاں رنگ لائیں گی۔ یہ اس لالہ کی حنابندی ہے جسے ایک دن کھلنا ہے، حسن البناء نے اپنے ماننے والوں میں جذبہ جہاد بھی پیدا کردیا تھا۔ معرکہ فلسطین اور سویز کی جنگ آزادی میں اخوان کے لوگوں نے شجاعت اور پامروی کا رکارڈ قائم کیا تھا، پھر حضرت حسین کو جس قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا تھا۔ اس طرح کے لوگوں سے ان کو سابقہ پڑا اور پھر حضرت حسین کی طرح اس فقیر بے نوا نے بھی جام شہادت نوش کیا۔ انہیں موت اس وقت آئی جب ان کا لگایا ہوا پودا پروان چڑھ چکا تھا اور اس کی جڑیں مضبوط ہوچکی تھیں۔ **شیخ حسن البناء سے پوچھنے والے نے ایک بار یہ سوال کیا کہ کیا دین وسیاست کا اجتماع ممکن ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ سیاست کے بغیر اسلام صرف نماز اور چند الفاظ کے مجموعہ کا نام رہ جائے گا جس کا زندگی کے مسائل سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔** ان کے اس جواب سے ان کے ذہن کو اور ان کی تحریک کو پورے طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

بیسویں صدی کی ایک اور اہم تحریک جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے وہ ترکی کی تحریک جماعۃ النور ہے۔ کمال اتاترک نے دین کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی۔ کمال اتاترک نے ملک سے اسلامی شعار کو مٹانے کی کوشش کی، عربی رسم الخط کو ممنوع قرار دیا۔ اذان عربی کے بجائے ترکی میں ہونے لگی۔ حجاب پر پابندی لگ گئی، سروں پر ہیٹ رکھ دیا گیا، اس مغرب پرستی کا علاج ''جماعت النور'' نے شروع کیا۔ جماعت نور کے بانی بدیع الزماں سعید نورسی تھے۔ کمال اتاترک کے خلاف دینی تحریک چلانے کی وجہ سے ان کو قید میں ڈال دیا گیا اور اس قید سے ان کو رہائی اس وقت ملی جب قید زندگی سے ان کو آزاد کردیا گیا۔ اس وقت ترکی میں جدید اسلامی بیداری نظر آتی ہے اس میں سعید نورسی کی کوششوں کا بڑا حصہ ہے۔ سعید نورسی کو جب جیل میں ڈال دیا گیا تو انھوں نے خطوط کے ذریعہ اسلامی اور روحانی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان رسائل النور کے اثرات سے سب نے استفادہ کیا۔ ان کی شخصیت میں کشش تھی او تحریر میں دلآویزی، مصطفیٰ کمال اتاترک کے اثرات کو مٹانے اور دین کی بقاء اور استحکام میں حصہ لینے میں جماعۃ النور کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے ان کو قید میں ڈالا گیا تھا۔ آج ترکی میں جو اسلامی بیداری نظر آتی ہے اس کا سہرا بڑی حد تک سعید نورسی کے سر پر ہے۔

بیسویں صدی میں برصغیر میں جو ایک بہت اہم اصلاحی اور اسلامی تحریک اٹھی وہ جماعت اسلامی کی تحریک ہے جس کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ جس طرح سے عالم اسلام کے دگرگوں حالات اور مغربی سامراج کے ظلم اور مغربی تہذیب کے غلبہ کے ردعمل میں پورے عالم اسلام میں بہت سی تحریکیں اٹھیں اسی طرح سے ہندستان سے بھی کئی تحریکیں اٹھیں۔ ان میں ایک اہم تحریک جماعت

اسلامی ہے۔مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کا یہ امتیاز ہے کہ اس نے ایک عظیم الشان اسلامی لٹریچر پیش کیا۔اس پہلو سے اس تحریک سے قریب کوئی تحریک ہے تو وہ الاخوان المسلمون کی تحریک ہے ورنہ باقی دوسری اسلامی تحریکوں کے پاس وسیع اور موثر لٹریچر کی کمی ہے۔ جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے صرف قرآن وحدیث کا مطالعہ نہیں کیا بلکہ دنیا کے نظریات اور خیالات اور جدید فلسفوں کا بھی مطالعہ کیا اور ان جدید فاسد نظریات کے مقابلہ کے لیے ایک نیا علم الکلام پیش کردیا۔اس تحریک نے وسیع اور ہمہ گیر ذہنی اور فکری انقلاب کی کوشش کی، اور ہزاروں تعلیم یافتہ لوگوں کو اپنی تحریروں سے متاثر کیا۔ان تحریروں کے عربی ترجمے ہوئے تو عرب دنیا کے مفکرین بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔مولانا مودودی نے دین اسلام کو ایک نظام کی حیثیت سے پیش کیا۔یعنی یہ دین صرف انفرادی اصلاح کا دین نہیں ہے بلکہ اجتماعی اقتصادی اور سیاسی نظام بھی رکھتا ہے۔ جماعت اسلامی کے غیر معمولی اثرات برصغیر کے ملکوں میں موجود ہیں اور عالمی سطح پر بھی اس کے نظریاتی اثرات پائے جاتے ہیں۔مولانا مودودی نے مغرب کے اعتراضات کا جواب دیا اور اردو زبان میں ایک نیا علم الکلام پیش کیا الجہاد فی الاسلام،سود، پردہ،ضبط ولادت حجیت حدیث جماعت کا خاص کلامی لٹریچر ہے۔

بیسویں صدی کا آفتاب طلوع ہوا تو یہ مسلمانوں کی نکبت اور ناسازگاری کا دور تھا۔معیشت پر زوال آچکا تھا،مغربی تہذیب اور عیسائیت کی فاتحانہ یلغار شروع ہوچکی تھی،زبان اور تہذیب ہر چیز خطرہ میں تھی۔اس عہد میں اسلام اور مسلمانوں کے تشخص کے دفاع کے لیے اور دین کی حفاظت کے لیے جو لوگ میدان عمل آئے ان میں ایک نام مولانا محمد الیاس کا ہے۔انھوں نے مسلمانوں کو مذہب سے وابستہ کرنے کے لیے ایک تحریک شروع کی جو عرف عام میں تبلیغی جماعت کے نام سے معروف ہے۔ یہ تحریک میوات سے شروع ہوئی اور پھر پورے ملک میں پھیلی اور اب دنیا کے تمام ملکوں میں پھیل چکی ہے۔راقم سطور کی نظر میں یہ ایک چلتی پھرتی خانقاہ ہے جہاں عبادت،نماز وذکر پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ پہلے لوگ روحانیت کی تلاش میں خانقاہوں میں جاتے تھے جب مولانا الیاس نے دیکھا کہ روحانیت کی پیاس کم ہوچکی ہے اور پیاسا کنویں کے پاس نہیں آتا ہے تو انھوں نے خود کنویں کو پیاسوں کے پاس بھیجنا شروع کردیا یعنی جماعتیں تبلیغ کے نام پر شہر شہر اور گاؤں گاؤں جانے لگیں اور دروازوں پر دستک دینے لگیں۔اس کام کی برکت سے لاکھوں لوگ نمازی بن گئے اور جو نمازی تھے وہ تہجد گزار بن گئے۔ ہر شہر میں تبلیغی جماعتیں گشت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں جنہیں دیکھ کر یہ اشعار زبان پر آتے ہیں:

یہ تیری گلیوں میں پھر رہے ہیں جو چاک داماں سے لوگ ساقی
کریں گے تاریخ مئے مرتب یہی پریشاں سے لوگ ساقی
لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ جلو میں صد انقلاب رمزاں
نہ جانے آتے ہیں کس جہاں سے یہ حشر داماں سے لوگ ساقی

☆☆☆

امید کی کرن

شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے

(عالم اسلام کی موجودہ صورت حال سے شکستہ دل ہونے کی ضرورت نہیں)

محمد الیاس ندوی بھٹکلی

پھر بھی ہمیں یہ گلہ ہے کہ ہم غالب نہیں:۔ گذشتہ ہفتہ عالمی خبروں میں ایک دل دہلانے والی اور خون کے آنسو رلانے والی خبر ہم سب کی نظروں سے گذری، یہ الگ بات ہے کہ ہم میں سے اکثر اس کو پڑھ کر غالباً آگے بڑھ گئے ،لیکن اس میں مجھ جیسے دسیوں طالب علموں کے لیے عالم اسلام کے موجودہ ناگفتہ بہ حالات کے پس منظر میں اٹھنے والے اس سوال کا جواب تھا کہ حق پر ہونے کے باوجود ہم اہلِ اسلام اس قدر مغلوب اور مظلوم کیوں ہو رہے ہیں اور اللہ تعالی کی مدد کیوں نہیں آرہی ہے؟ خبر یہ تھی کہ لبنان ،شام اور مصر وغیرہ جاکر دادعیش دینے والے عرب نوجوان وہاں کے غیر موزوں سیاحتی حالات کی وجہ سے آج کل برطانیہ کا رخ کررہے ہیں ،وہاں ان کی عیاشی ،شراب وکباب اور موج مستی میں روزانہ خرچ ہونے والی فضول خرچی واسراف کا اندازہ آپ صرف اس بات سے لگاسکتے ہیں کہ وہ اپنے استعمال میں رکھنے والی رولکس اور ڈیلکس کاروں کا یومیہ صرف کرایہ ہی ۱۹؍ہزار ڈالر یعنی بارہ لاکھ روپے روزانہ ادا کررہے ہیں، کچھ ہی دنوں پہلے متحدہ عرب امارات سے بھی ایک خبر آئی تھی کہ وہاں ایک نئے اٹلانٹک نامی ہوٹل کے افتتاح کے موقع پر آتش بازی پر سمندر میں موجود ۲۲۶ کشتیوں کے ذریعہ ڈیڑھ سو ملین یعنی پندرہ کروڑ روپے چند گھنٹے میں پھونک دیئے گئے ،اس فضول خرچی کے نظارہ کے لیے فلم انڈسٹریز سے وابستہ دو ہزار لوگوں کو مدعو کرکے ان پر دو سو ملین یعنی بیس کروڑ روپے خرچ کئے گئے اور خود اس ہوٹل کی تعمیر پر پچھتّر ارب روپے کی لاگت آئی۔

ان ہی اخبارات میں دوسری طرف یہ بھی تشویشناک اور نینداڑانے والی خبر تھی کہ شام سے لبنان، ترکی اور اردن وغیرہ ہجرت کرکے جانے والے اور وہاں کیمپوں میں مقیم پندرہ لاکھ سے زائد پناہ گزینوں میں سے بیشتر لوگ ایک ایک لقمہ کے لیے ترس رہے ہیں، دمشق کے جنوب میں واقع یرموک کیمپ میں نوے دن کے مسلسل محاصرہ کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ لوگوں نے وہاں جامع مسجد کے ایک امام

کے فتوی پر عمل کرتے ہوئے اپنی بھوک مٹانے اور جان بچانے کے لئے کتے ، بلیوں اور مردہ جانوروں تک کو کھانا شروع کردیا ہے، نوزائیدہ معصوم بچوں کی بڑی تعداد اپنی بھوک وفاقہ کش ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ کے نہ ہونے کی وجہ سے بلک بلک کر جان دے رہے ہیں، برما کے مظلوم مسلمان اپنے گھروں سے بے گھر ہوکر آسمان کی چھتوں تلے بے سہارا پڑے ہوئے ہیں، ان کا کوئی پرسان حال نہیں، غزہ کے فلسطینی مظلومین ظالم مصری فوجوں کی طرف سے سرحدوں اور سرنگوں کے اچانک بند کئے جانے کی وجہ سے غلّوں سے محروم ہوگئے ہیں اور ہرطرف سے محصور ہونے کی وجہ سے ایک وقت کا چولہا جلنا بھی ان کے یہاں ممکن نہیں ہے۔

سوال عذاب کے ٹلنے کا نہیں بڑے عذاب کے نہ آنے کا ہوناچاہیے :۔ عالم اسلام بالخصوص عالم عرب کے موجودہ حالات کو ہم جب سامنے رکھتے ہیں اور وہاں کے شہزادوں اور خوش حال ومتمول طبقہ کی عیاشی وفضول خرچی، اسلام دشمنوں سے ذاتی مفادات اور اپنے اقتدار کے تحفظ کی خاطر مسلم وعرب حکمرانوں کی اسلام دشمنوں سے سازباز، اسلام پسندوں سے ان کی نفرت ووحشت اور عامۃ المسلمین پر انسانیت سوز مظالم پر ان کی مجرمانہ خاموشی وغیرہ کا قرآن وحدیث کی روشنی میں ہم جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچنے میں دیر نہیں لگتی کہ اب روایتی مسلمانوں سے ملت کی قیادت چھین کر کسی اور کے حوالہ کی جانے والی ہے اور غالبًا قیادت کے اس خلا کو مغرب کے حمیت پسند نومسلموں یا پھر مشرق بعید وبرصغیر کے غیرت مند مسلمانوں سے پر کیا جانے والا ہے، اللہ تعالی قرآن مجید میں فرماتے ہیں کہ ہم جب کسی قوم کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس میں موجود متمول اور خوشحال طبقہ کو اپنے فسق وفجور میں آگے بڑھنے کی چھوٹ دے دیتے ہیں ، پھر ہمارا وعدہ پورا ہوتا ہے اور ہم پوری قوم کو تباہ وبرباد کردیتے ہیں (وإذا أردنا أن نهلك قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمّرناها تدميرا)، آج ملت اسلامیہ میں عوام میں بڑھتی دینداری، ودین پسندی لیکن اس کے برخلاف خواص وحکمرانوں اور سرمایہ داروں میں اسلام کے مقابلہ میں ذاتی مفادات کی ترجیح کے بڑھتے رجحان کو دیکھتے ہوئے صاف نظر آرہا ہے کہ اللہ تعالی کا یہ وعدہ جلد ہی پورا ہونے والا ہے۔

عالم اسلام بالخصوص عالم عرب کی موجودہ صورت حال و اخلاقی انارکی کے اس پس منظر میں اب ہمارا سوال یہ ہونا چاہیے کہ حالات کے اس قدر دگرگوں ہونے اور پانی سر سے اونچا ہونے کے باوجود ہم کیسے بچے ہوئے ہیں اور ہم پر وعدہ خداوندی کے مطابق عذاب کیوں نہیں آرہا ہے، اس کی بھی وجہ سن لیجئے، رحمت عالم ﷺ نے رو رو کر اپنی امت اور ہمارے حق میں التجا کی تھی کہ ائے رحیم وکریم آقا : پچھلی امتوں کی طرح میری امت کو اس کی نافرمانی واخلاقی انارکی کی وجہ سے اجتماعی طور پر ہلاک نہ فرما، اللہ رب العزت نے اپنی غیر معمولی رحمت ورافت کی وجہ سے اپنے حبیب ﷺ کی اس دعا کو شرف قبولیت سے نوازا، اگر رحمت خداوندی کا یہ مظہر وعدہ خداوندی کی شکل میں نہ ہوتا تو ہم کب کے ہلاک

کردیئے جاتے اور ہماری جگہ دعوتی فرض منصبی کی ادائیگی کے لیے دوسری قوم آگئی ہوتی۔

لیکن حالات سے مایوس ہونے کی بھی ضرورت نہیں:۔ مسلمان عالمی سطح پر اس وقت جن حالات سے دوچار ہیں بظاہر ایسا لگتا ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں اس طرح کے حالات نہیں آئے، مشرق سے مغرب تک مسلمان بڑی کسمپرسی کی حالت میں ہیں، روزانہ کے اخبارات میں خبروں کا دوتہائی حصہ فلسطین/شام/افغانستان/مصر/برما/بنگلہ دیش/ترکی/تیونس/یمن اور لیبیا وغیرہ کے مسلمانوں کی مظلومیت کی خبروں سے بھرا رہتا ہے، پوری دنیا سے اوسطاً ۵۰۰ مسلمانوں کی روز شہادت کی خبریں آرہی ہیں، خود مسلمانوں کے آپسی انتشار واختلاف، خانہ جنگی اور ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہونے اور اس کے نتیجہ میں بہنے والے خون خرابے اور پوری دنیا کے سامنے ملت اسلامیہ کے تماشہ بننے کی خبروں سے ایک عام مؤمن کا دل بھی بیٹھ جاتا ہے، لیکن ہمیں ان حالات سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، اس سے دس گنا برے اور خراب حالات کا ہماری ملت سامنا کرچکی ہے اور ہر بار وہ اپنی خوداعتمادی اور بصیرت دینی وفراست ایمانی سے اس کا کامیاب مقابلہ بھی کرچکی ہے، آپ کو یہ یاد ہوگا کہ ہمارے آپسی انتشار اور خانہ جنگی کی انتہا اس وقت ہوگئی تھی جب اس کی زد میں خانہ کعبہ جیسا مرکز اسلام بھی آگیا تھا، ۶۴ھ میں خود مسلمانوں کی طرف سے کعبۃ اللہ کے غلاف کو جلایا گیا، اس کی چھت کو گرایا گیا، اس پر سنگ باری کی گئی اور اس کا اس طرح محاصرہ کیا گیا کہ کئی دنوں تک اس کے طواف سے مسلمان محروم رہے، جنگ جمل ۳۶ھ میں حضرت علیؓ وحضرت عائشہؓ کے درمیان غلط فہمیوں کی بناء پر خود مسلمانوں میں سے دس ہزار سے زائد صحابہ کرام وتابعین عظام شہید ہوئے، حضرت عائشہؓ کی طرف سے لڑنے والے تیس ہزار مسلمانوں میں سے نو ہزار اور حضرت علیؓ کی طرف سے لڑنے والے بیس ہزار مسلمانوں میں سے ایک ہزار ستر مسلمان کام آئے، یہ سب یہودی منافق عبداللہ بن سبا کی طرف سے مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی ایک کامیاب ومنصوبہ بند سازش تھی جس کا بعد میں فریقین کو احساس بھی ہوگیا، اس کے بعد جنگ صفین میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان بھی موجودہ عراق میں کوفہ کے جنوب میں ایک شدید جنگ ۳۷ھ میں ہوئی، ۶۳ھ میں اسی طرح کی مسلمانوں کی ایک اور آپسی خانہ جنگی میں مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا جس میں تین سو شرفاء قریش وانصار کے علاوہ ایک ہزار مسلمان خود مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہوئے اور مسجد نبوی بھی کئی دنوں تک نمازیوں سے محروم رہی، خود نبی اکرم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد حضرت ابوبکرؓ نے جن حالات کا سامنا کیا اس طرح کے حالات کا آج ہم تصور بھی نہیں کرسکتے، ایک طرف جھوٹے مدعیان نبوت سامنے آئے تو دوسری طرف ایک بڑی تعداد نے زکاۃ دینے سے انکار کردیا، ایک طرف اسلامی دارالخلافہ پر حملہ کی سازش کی خبریں آئیں تو دوسری طرف مرتدین اسلام نے ناک میں دم کردیا، لیکن جس قوت ایمانی اور اولوالعزمی کے ساتھ صدیق

اکبرؒ نے محض اللہ تعالی کے فضل سے اس کا کامیاب مقابلہ کیا وہ اسلامی تاریخ میں ان ہی کا حصہ تھا، ۶۵۶ھ میں تو عالم اسلام میں مسلمانوں کے ساتھ وہ سانحہ پیش آیا جو بقول مشہور مؤرخ علامہ ابن الاثیر پوری اسلامی ہی نہیں بلکہ انسانی تاریخ میں بھی پیش نہیں آیا، اسلامی دارالخلافہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجائی گئی اور اٹھارہ لاکھ مسلمان بیک وقت صرف بغداد میں شہید کردیئے گئے، ان کی لاشوں کی بدبو سینکڑوں میل دور ملک شام میں دمشق تک پھیل گئی۔

جہاں مسلمان مغلوب ہوئے وہاں اسلام غالب آیا:۔ لیکن ان سب واقعات کا آپ تجزیہ کریں گے تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ ایک طرف مسلمان مغلوب ہوئے تو دوسری طرف اسلام غالب آیا، مشرق میں مسلمانوں کی مظلومیت نے مغرب میں اسلام کو اپنی تاثیر دکھانے کا موقع دیا، تاتاریوں نے مسلمانوں کو زیر کیا تو اسلام نے تاتاریوں کو اپنا اسیر بنایا اور کچھ ہی دنوں میں ظالم وسفاک تاتاری قوم خود حلقہ بگوش اسلام ہوگئی، آج افغانستان اور چیچنیا وغیرہ میں موجود مسلم مجاہدین ان ہی نومسلم تاتاریوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، عہد صدیق اکبرؓ میں ان مذکورہ بالا گوناگوں مسائل کے باوجود جزیرۃ العرب کے باہر اسلام دوسری طرف اپنا دائرہ وسیع کررہا تھا، جنگ جمل وصفین میں مسلمانوں کی خانہ جنگی کے باوجود اسی زمانہ میں اسلام ایشیاء وافریقہ سے نکل کر یوروپ وآسٹریلیا میں اپنے جھنڈے گاڑ رہا تھا، ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی پوری دنیا میں مسلمانوں کی سیاسی عمارت کی چھت بیٹھ گئی اور ایک کروڑ ستاون لاکھ مربع کلومیٹر سے مسلم ممالک کا رقبہ ۴۵ لاکھ مربع کلومیٹر میں آکر سکڑ گیا، روس، امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ کی بندر بانٹ میں دوتہائی مسلم ممالک کو ہڑپ کرلیا گیا، لیکن صرف ڈیڑھ سو سال میں یہ رقبہ جو ہم سے چھین لیا گیا تھا اس سے دوسوگنا رقبہ اللہ تعالی نے ہمیں واپس دیا، نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں رقبہ میں ۲۱ فیصد کے ساتھ مسلم ممالک تین کروڑ سے زائد رقبہ کے مالک ہیں اور ۲۲۸ ممالک میں ۵۸ آزاد مسلم ممالک عالم اسلام کے پاس ہیں اور صرف گذشتہ ۳۷ سالوں میں مسلمانوں کی آبادی میں ۳۹ کروڑ کا اضافہ ہوا ہے، اسی طرح ۱۱/ستمبر کے امریکی حادثہ کو لیجئے، اس واقعہ کے حوالہ سے پوری دنیا میں مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھائے گئے، افغانستان کو تباہ وبرباد کیا گیا، عراق پر حملہ کیا گیا، ترکی کو نشانہ بنایا گیا، لیکن دوسری طرف آپ دیکھئے کہ اسی حادثہ نے یوروپ کی ایک بڑی تعداد کو اسلام کو سمجھنے پر آمادہ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ گذشتہ ۱۳ سالوں میں یورپ اور امریکہ میں جتنے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور قرآن مجید کی طلب میں اضافہ ہوا اتنے پچھلے پچاس سال میں نہیں ہوا، ان سطور کو تحریر کرتے ہوئے کل ہی یعنی ۱۲ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو رائٹر کی عالمی یورپی نیوز ایجنسی نے ایک ایسی خوش کن خبر نشر کی جس سے ہم جیسے کمزور ایمان والوں اور عالم اسلام کے حالات سے متاثر اور دل برداشتہ وافسردہ لوگوں کا بھی غم ہلکا ہوگیا، اس نے اکونامک ٹائمز کے حوالہ سے لکھا کہ امریکہ میں ۱۱ ستمبر کے حادثہ کے بعد صرف برطانیہ میں گذشتہ تیرہ سال میں ایک لاکھ سے زائد برطانوی بندگان خدا نے اسلام قبول کیا اور اس

وقت بھی سالانہ ۵۲۰۰ لوگ صرف برطانیہ میں حلقہ بگوش اسلام ہورہے ہیں، دوسری طرف اس نے لکھا ہے کہ خود امریکہ میں بھی اس سے چھ گنا زیادہ لوگ اس وقت اسلام میں داخل ہورہے ہیں اوران کا سالانہ اوسط تیس ہزار سے زیادہ ہے ،سابق امریکی صدر بل کلنٹن نے خود اپنے عہد صدارت میں اس بات کا اعتراف کیا کہ امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد ساٹھ لاکھ سے زائد ہوگئی ہے اور ایک چوتھائی مسلمان ان میں نومسلم ہیں،غرض یہ کہ آپ نے دیکھا کہ کسی ایک جگہ مسلمانوں کو دبانے کی کوشش کی گئی تو دوسری جگہ اسلام نے سراٹھا کراپنے وجود کا ثبوت دیا،ایک خطہ میں وہ مظلوم ہوئے تو دوسرے علاقہ میں فاتح بن کراپنے زندہ ہونے کا اعلان کیا،مشرق وسطی کے موجودہ حالات میں بھی ہمیں یقین ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اللہ تعالی کی قدرت کاملہ کا پھراسی طرح ظہور ہونے والا ہے اور مسلمانوں کی مغلوبیت اسلام کی غالبیت کی شکل میں سامنے آنے والی ہے۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے اُدھر نکلے ،اُدھر ڈوبے ادھر نکلے

ظاہری زوال ہی اسلامی بیداری کا پیش خیمہ ثابت ہوا:۔ ۱۹۲۴ء میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کرکے اسلام دشمن عناصر مطمئن ہوگئے کہ اب ہم نے مسلمانوں کی رہی سہی سیاسی ساکھ بھی ختم کردی اوران کی سیاسی بساط لپیٹ دی گئی ، ۱۹۴۸ء میں قلب اسلام میں فلسطین پر قبضہ کرتے ہوئے اسرائیل کو وجود بخش کر مغرب نے یہ سمجھا کہ اب مسلمان سرنہیں اٹھائیں گے، پھر ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر بھی اسرائیل کا قبضہ کراکے مسلم دشمن طاقتیں اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگئیں کہ مسلم قیادت نے صہیونیت کے سامنے گھٹنے ٹیک کراپنی آخری بے بسی کا ثبوت دیا،لیکن آپ کو یہ معلوم کرکے نہایت حیرت انگیز مسرت ہوگی کہ گذشتہ نصف صدی میں یہی تینوں عالمی واقعات مسلمانوں میں سیاسی بیداری کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئے،مسلم امت نے یہیں سے ایک نئی کروٹ لی،خواب غفلت سے بیدار ہوئی،تعلیم پر مسلمانوں کی از سرنو توجہ شروع ہوئی ،اصلاحی وفکری اسلامی تحریکات کو کھل کر میدان میں آنے کا موقع ملا،نئی تعلیم یافتہ مسلم نسل کا اسلام پر از سرنو اعتماد بحال ہوا اوراسی مدت میں ان کو یورپ ومغرب میں اسلام کے تعارف کے غیر معمولی دعوتی مواقع بھی حاصل ہوئے،۱۹۶۷ء میں قبلۂ اول پر صہیونیت کے ناجائز قبضہ کے بعد ہدایت سے محروم بندگان خدا کو اسلام کو سمجھنے میں جتنی کامیابی ملی پچھلے سوسال میں نہیں ملی،ہمیں بصیرت وفراست کی نگاہوں سے ان ناگفتہ بہ حالات کے دعوتی تجزیہ سے یہ اطمینان بھی ہوتا ہے کہ عالم اسلام میں پائی جانے والی اس بے بسی کی کیفیت اور ملت اسلامیہ کی مظلومیت اور مسلم امت کے حق میں بظاہر اسلام دشمن طاقتوں کی منصوبہ بند کوششوں میں کامیابی سے مسلمانوں کو تو ظاہری اعتبار سے وہ نقصان پہنچانے میں کامیاب رہے لیکن اسلام کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے،اس کے انقلاب آفریں پیغام کی تاثیر کے بڑھتے قدم کو روکنے میں ان کو ذرہ برابر بھی کامیابی نہیں ملی،

لاکھوں کی تعداد میں مسلمانوں کو تو انہوں نے شہید کیا، ان سے ان کی زمینوں کو چھینا، ملّت کی خواتین کو بیواؤں اور معصوم نونہالوں کو یتیموں کی صف میں لاکھڑا کردیا، ناقابل یقین حد تک ان کو مالی نقصان پہنچایا اور سیاسی طور پر ان کو پسپا بھی کیا، لیکن وہ اسلام کے تئیں مسلمانوں کے غیر متزلزل یقین واعتماد کی دولت کو ان سے چھین نہیں سکے، دین حق سے ان کی وابستگی میں کمی نہیں کرسکے، اسلام سے نسبت پر ان کے افتخار کی دولت کو واپس نہیں لے سکے بلکہ یہی آزمائشیں، مسائل ومصائب نہ صرف ان کو ان کے مذہب ودین سے قریب کرنے کا ذریعہ بنے بلکہ اس سے بڑھ کر معرفت خداوندی سے محروم بندگان خدا کی ایک بڑی تعداد کو اپنے مالک حقیقی کی پہچان کرانے کا بھی ذریعہ بنے، ہالینڈ میں گستاخانہ کارٹون بنا کر وہ سمجھتے رہے کہ ہم خالق کائنات کی طرف سے حیاۃ طیبہ اور سیرت مطہرہ کی صورت میں انسانیت کے لیے دیئے گئے صاف وشفاف آئینہ کو دھندلا ثابت کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے، لیکن ان کی یہ کوشش خام خیال ثابت ہوکر اس وقت سامنے آئی جب یورپ کی تعلیم یافتہ غیر مسلم نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو حضرت محمد ﷺ کی مثالی شخصیت کے مطالعہ اور اس کو سمجھنے کی طرف اسی کارٹون کے خلاف مسلمانوں میں عالمی سطح پر برپا ہونے والے ہنگامہ نے آمادہ کیا اور اس میں سے کئی لوگوں کو اسلام کی دولت بھی نصیب ہوئی، گذشتہ دنوں فیس بک پر جب ایک بے ہودہ فلم کے ذریعہ سیرت طیبہ کو داغدار کرنے کی ناکام کوشش ہوئی تو ہم نے مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی بھٹکل کی طرف سے اسی فیس بک پر غیر مسلموں کے لیے عالمی سطح پر ایک تحریری مقابلہ کا اعلان کیا اور رحمت عالم ﷺ کی تعلیمات میں امن کا پیغام کے موضوع پر سب سے اچھے تین مضامین لکھنے والے غیر مسلموں کو دس لاکھ روپئے کے نقد ترغیبی انعامات کا اعلان ہوا تاکہ وہ براہ راست اس بہانہ اسلام کا مطالعہ کرسکیں اور توحید ورسالت کے پیغام سے بھی روشناس ہوسکیں، اس سلسلہ میں ہم نے ان کو ویب سائٹ بنا کر اس موضوع پر توحید ورسالت اور سیرت کے موضوع پر مواد بھی فراہم کیا، آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ صرف چھ ماہ میں الحمدللہ ۳۷ ملکوں سے تین ہزار سے زائد تعلیم یافتہ غیر مسلم بندگان خدا نے اس مقابلہ میں حصہ لیا اور جب مقالات موصول ہوئے تو اس میں سے کئی شرکاء نے اس دوران براہ راست اسلام کو سمجھنے کے بعد شرک وکفر سے تائب ہونے کا صاف اعلان کیا، اس نایاب وتاریخی موقع سے فائدہ اٹھا کر جنہوں نے براہ راست اسلام کو سمجھا اوران کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا ان کی تعداد تو اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔

لیکن ایک تشویشناک پہلو:۔ مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں ہمیں اس کا تو اندازہ ہوگیا کہ الحمدللہ مسلمانوں کے مغلوب ومظلوم بن کر عالمی نقشہ میں سامنے آنے کے باوجود اسلام غالب آرہا ہے، مسلمانوں کے ذاتی، سیاسی اور اقتصادی نقصان کے باوجود دین حق اپنا اثر پہلے سے زیادہ دکھا رہا ہے اور اسلام کے دائرہ میں برابر وسعت پیدا ہورہی ہے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں میں بھی

دینی بیداری آرہی ہے، پہلے سے زیادہ مساجد تعمیر ہورہی ہیں،لوگ مسجدوں کا رخ کررہے ہیں ،نمازیوں میں برابراضافہ ہورہاہے ،دینی اجتماعات میں پہلے سے زیادہ لوگ شریک ہورہے ہیں،حج وعمرہ کرنے والوں کی تعداد میں ہرسال حیرت انگیز اضافہ ہورہاہے ،متمول وخوشحال گھرانہ کے لوگ اب یورپ جاکر اپنی فیملی کے ساتھ سیروتفریح کے بجائے حرمین شریفین میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ حاضری کو ترجیح دے رہے ہیں،حفاظ وعلماء کی تعداد بڑھ رہی ہے، مدارس ودینی مراکز اپنادینی دائرہ وسیع کررہے ہیں، اسلامی تنظیمیں پہلے سے زیادہ قائم ہورہی ہیں، نئے نئے رفاہی وسماجی کاموں کے ادارے تیزی سے وجود میں آرہے ہیں اور واقعی ان اداروں سے کام بھی ہورہاہے ۔لیکن ان سب کے باوجود ایک تشویشناک پہلو یہ ہے کہ ہماری ملت میں ملّی شعور ابھی ٹھیک سے بیدار نہیں ہوا ہے، دین سے وابستگی تو بڑھ رہی ہے لیکن دشمنوں کی چالوں کو سمجھ کر اس کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت میں اضافہ نہیں ہورہاہے ،اعداء اسلام کے منصوبوں کو سامنے رکھ کر بصیرت وفراست سے اس کے مقابلہ کی قوت میں ترقی نہیں ہورہی ہے ،مسلمان خود تو دین پر قائم رہنا چاہتے ہیں لیکن اسلام برائے انسانیت اور اللہ تعالی کے رب المسلمین کے بجائے رب العالمین ہونے کے قرآنی وآفاقی پیغام کو عام کرنے کی ضرورت کا مکمل احساس نہیں ہورہاہے ،اللہ تعالی کی زمین پر اللہ تعالی ہی کے احکام کے نفاذ، اقامت دین ،خالص اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور محرمات ومنکرات سے پاک خالص دینی بنیادوں پر مالیات ،اقتصادیات اور سیاسیات وسماجیات کے اسلامی نمونوں کو انسانیت کے سامنے لانے اور بلکتی ،تڑپتی ،سسکتی انسانیت کے سامنے اس کا ماڈل پیش کرنے کی کوئی بڑی منصوبہ بندی نہیں ہورہی ہے ،ہماری طرف سے اس کے لیے بھر پور کوشش تو درکنار اس کے لیے کی جانے والی کوششوں میں ہاتھ بٹھانے یا کم ازکم تنقید وتنقیص نہ کرکے اس کی حوصلہ شکنی کے بجائے خاموش ہی رہ کر اس کو آگے بڑھنے دینے کی بھی اپنے اندر سکت وجرأت اب باقی نہیں رہ گئی ہے ،ورنہ کیا وجہ ہے کہ ہالینڈ میں بننے والے گستاخانہ کارٹون پر تو عالم اسلام میں ہنگامہ برپا ہوتاہے اور پوری ملت تڑپ اٹھتی ہے اور یقیناً یہ احتجاج محسن انسانیت ﷺ سے ہمارے والہانہ تعلق کی وجہ سے عین فطری اور مطلوب بھی تھا،لیکن اسی محسن انسانیت ﷺ کے لائے ہوئے دین اسلام کے خلاف برپا کی جانے والی مغربی سازش کو مصر والجزائر میں کامیاب ہوتا دیکھ کر غیرت منداور حمیت پسند مسلمانوں کا دل تڑپ نہیں اٹھتاہے ،یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ امریکی ویورپی طاقتیں صرف اسلام پسند حکومتوں اور دینی سلطنتوں کو بدنام کرنے میں دلچسپی نہیں رکھیں بلکہ ان کو صہیونیت کی ناپاک اسرائیلی حکومت کے لیے خطرہ بننے والے اشتراکی حکمرانوں مثلاً عراق کے صدام حسین اور لیبیا کے معمر قذافی سے بھی اتنی ہی نفرت ہے جتنی ترکی کے طیب اردگان اور مصر کے محمد مرسی جیسے اسلام پسند قائدین سے ہے ،عالم اسلام میں اس کے خلاف احتجاجات نظر نہیں آئے ،جتنی

مبارک کے خلاف اٹھنے والی تحریک میں اخوان کا ساتھ دینے والے آخر صرف ۵۲ فیصد ووٹر کیوں تھے، بقیہ ۴۸ فیصد مصریوں کو اسلام سے نفرت و وحشت رکھنے والی سیاسی پارٹیوں سے محبت کیوں تھی اور ان کے حق میں انہوں نے ووٹ کیوں دیا، اخوان کی تحریک جس کی پوری قیادت خالص تعلیم یافتہ، سمجھ دار، ہوش مند، حمیت پسند ارکان پر مشتمل ہے اور جنہوں نے حسنی مبارک کو ہٹانے کے بعد بھی ایک سال تک نہایت اعتدال وتوازن کے ساتھ حکمرانی کی کوشش کی اور اپنے خالص اسلامی ایجنڈے کو حکمتاً نافذ کرنا تو دور کی بات اس کا اظہار کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا، اخوان جن سے محبت بقول مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ایمان کی علامت اور ان سے بغض ونفرت اسلام سے نفرت کے مترادف ہے ان کی جمہوری واسلامی قیادت سے عرب حکمرانوں کو تو خطرہ محسوس ہوا اور اپنی حکومت کو بچانے کے نشہ میں بعض عرب حکمرانوں نے اسلام دشمن قابض مسیحی ویہودی حکومت سے اپنے کو وابستہ رکھ کر اخوان کی آڑ میں اسی اسلامی نظام سے بغاوت کا اعلان کیا لیکن مسلم عوام کی ایک چھوٹی سی تعداد کو چھوڑ کر باقی عامۃ المسلمین نے اس کے گھمبیر نتائج کو محسوس کرنے کے باوجود عالم اسلام وعالم عرب میں کیوں چپ سادہ لی، خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد ہمارے آباء واجداد ہی تھے جو ہم سے کم تعلیم یافتہ تھے اور بظاہر بھولے بھالے سمجھے جاتے تھے لیکن ان کی فراست وبصیرت کی داد دیجئے کہ انہوں نے اس کے مضمرات کو سمجھ کر پورے عالم اسلام کو اسی وقت سرتاپا احتجاج بنادیا، برصغیر میں خلافت تحریک اسی پس منظر میں شروع ہوئی تھی، خلافت عثمانیہ کے زوال سے بھی بڑھ کر اخوان کی آڑ میں ایک کامیاب اسلامی سلطنت کے قیام کی کامیاب کوششوں کو ناکام کرنے کی اسلام دشمنوں کی ایک فیصلہ کن کوشش مصر میں ہوئی، لیکن افسوس دشمن کی منصوبہ بندی اور اس کے خلاف ان کی اس آخری کوشش کے نتائج کے سمجھنے کے بجائے مغرب ویورپ سے زیادہ اس کی مخالفت میں خود اپنے نظر آئے، دراصل یہ اسی ملّی شعور کے فقدان یا کمی کا نتیجہ تھا، جس نے کہا سچ کہا تھا ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ملت اسلامیہ میں نظر آنے والے اس ملی احساس کے فقدان اور بے ضمیری کے محرکات اور اسباب کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو اس کا بنیادی سبب موجودہ نصاب ونظام تعلیم نظر آتا ہے، پہلے وہی لوگ مغرب سے مرعوب اور دین بیزار ہوتے تھے جو یورپ وامریکہ جا کر وہاں کے نظام تعلیم سے وابستہ رہ کر واپس آتے، اب دشمنوں نے بڑی حکمت عملی اور عیاری سے اس نظام تعلیم کو مسلم ملکوں ہی میں اس طرح رائج کردیا ہے کہ مسلمانوں کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کس طرح غیر شعوری طور پر اس نظام تعلیم کی وجہ سے اپنے دین سے وابستہ رہنے کے باوجود اپنے مذہب پر خود اعتمادی کی دولت سے خاموشی سے محروم ہورہے ہیں، یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر انشاء اللہ آئندہ تفصیلی روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

☆☆☆

شخصیات

سردار چلا گیا
(سید حامد مرحوم)

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی
شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سید حامد (۱۹۲۰-۲۰۱۴) جس طرح وجیہ وشکیل تھے اسی طرح انہیں روحانیت بھی ودیعت ہوئی تھی، یہ روحانیت ان کی تحریروں اور تقریروں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ جو ہر روحانی خوف خداوندی ارو جذبۂ دردمندی سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان ان دونوں چیزوں سے خالی ہے تو اس کے اور حیوان کے درمیان خط امتیاز کھینچنا امر دشوار ہے، علامہ اقبال اس فلسفے سے بخوبی واقف تھے، اسی لیے انہوں نے بتایا کہ تخلیق انسانی کی غایت محض دردمندی ہے، اسی لیے سید حامد نے علامہ اقبال کے جذبہ انسانی پر ایک مدلل مقالہ تحریر کیا نیز اظہار افسوس بھی کہ ہم نے علامہ اقبال کو شاعر مشرق کہہ کر انہیں محدود ومقید کر دیا ہے۔ بہر کیف سید حامد کے جذبۂ انسانیت کو ان کی افسر شاہی، تعلیمی نظریات، تصانیف، اسفار اور وائس چانسلر شپ کے درمیان ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، اسی سے سید صاحب کی پوری زندگی وابستہ ہے۔ اپنی تمام عظمتوں کے باوجود ملت کے درد میں دور دراز کے سفر کرتے، قدم قدم پر صعوبتیں ان سے چمٹ جاتیں، دھول سے اٹ جاتے، گرمیوں میں دھاردار پسینے چلتے لیکن ''تعلیمی کارواں'' کا بہر حال ساتھ دیتے، کبھی کبھی بڑی مشکل سے بس میں جگہ ملتی، سمٹ سمٹا کر بیٹھتے اور اپنے کھڑے ہوئے ساتھیوں کو اپنے پہلو میں چھپا لیتے، سید صاحب کی پوری زندگی میں ہما ہمی اور گہما گہمی ہے لیکن ان سب کا تعلق ملت کے دکھ درد اور اس کے سقوط وانحطاط سے ہے، شب وروز اسی ادھیڑ بن میں لگے رہتے، ان کا سوز نہاں ان کی تحریروں سے عیاں ہے۔ علی گڑھ کے دور وائس چانسلری میں انہیں کمیونسٹ زاز کہا گیا اور ان کے دست راست پروفیسر اسرار احمد کو قادیانیت سے منسوب کیا گیا، نیز روایات علی گڑھ کا قاتل بھی، یہ سب معاندین سید حامد کی الزام تراشیاں اور دشنام طرازیاں تھیں تاکہ انہیں یہاں سے بھگایا جائے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ دشمنان جامعہ کے سامنے سپر ڈال ہی دی اور یہاں سے جانے کو ٹھان لی، آنجہانی اندرا گاندھی کے ہم رہین منت ہیں کہ انہوں نے براہ راست سید صاحب سے رابطہ کر کے فرمایا کہ ہم آپ کی ہر طرح کی مدد کرنے کے لئے تیار ہیں، آپ کو ہرگز استعفا دینے یا جانے کی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ سید صاحب کے متزلزل قدموں میں ثبات آیا، اسی ثبات قدمی نے ادارۂ سرسید کو ایک بڑے طوفان سے بچا لیا، یہی وجہ ہے کہ اندرا

گاندھی کے انتقال پر جو خوبصورت مضامین تحریر کئے گئے ان میں سے مؤثر مضمون سید صاحب کا تھا۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ سید حامد کی انگریزی اور اردو دونوں تحریریں ادق ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی لغات کی ضرورت پڑ جاتی۔ لیکن زبان پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قدیم فارسی اور اردو ادبیات کا دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا بالخصوص قدیم ادبیات کا کیوں کہ اس کے بغیر نہ تو آفاقیت آسکتی ہے اور نہ ہی ذخیرۂ الفاظ کی دولت۔ انہیں ابتداء ہی سے مطالعۂ ادبیات کا ذوق تھا، انہیں پروفیسر ہونے کے لئے Points کی ضرورت نہ تھی، یہی تو وجہ ہے کہ آج کے Pointed propessed خالی الظرف ہے، اسے غبار خاطر، فسانۂ عجائب اور طلسم ہوشربا پڑھنے کی نوبت آئی تو بغلیں جھانکنے لگے گا، سید حامد ادارۂ سیر سید سے انگریزی و فارسی دونوں میں ایم اے تھے، درسیات کے بعد اپنے ذاتی مطالعہ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ انہیں ایک امانت دار ملازم کے ساتھ دانشور بھی کہا جا سکتا ہے جن کی دانشوری مضامین سے چھن کر آتی ہے۔

مولانا دریابادیؒ نے علامہ شبلی نعمانی کو مصنف اور مصنف گر کہا تھا، سید حامد کو ادارہ اور ادارہ ساز کہا جائے تو بے جا نہیں، ادارہ سازی کے لئے جدو جہد کرتے رہے، جہاں گئے ایک چھاپ چھوڑ گئے، کیوں کہ انہیں کبھی خود سے غرض نہ رہی۔ ان کی تمام اغراض اور اہداف ملت اسلامیہ ہند تھے۔ اسے بتانا اور غار سقوط سے نکالنا ہی ان کا محور رہا۔ ان کے ثقافتی احساس نے انہیں کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ یہ تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو کی بقاء کے لئے حد درجہ متفکر تھے، اردو اداروں کو مستحکم دیکھنے کے تمنائی رہے، چنانچہ جب انہیں حیدرآباد کی اردو اکیڈمی کی جانب سوالاکھ کی انعامی رقم ملی تو انہوں نے اسے دار المصنفین شبلی اکیڈمی منتقل کر دیا، صرف اس لئے کہ یہ اسلامیات کے ساتھ اردو ادب کا ایک بڑا مرکز ہے، اسی طرح سید حامد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر ہیں جنہوں نے مدارس کے لئے راہیں ہموار کیں کہ وہ یونیورسٹی آکر ایک نئی دنیا کا مشاہدہ کرسکیں، اس سے ان کی سوچ میں تبدیلی آئے گی، ذہنی وسعت نصیب ہوگی اور ان کے سامنے علم و معرفت کے نئے دروا ہوں گے، اور یہ فارغین مدارس یہاں کی مادی فضا میں روحانی رنگ گھولیں گے، یہاں دینداری بڑھے گی اور اسلام کو سمجھنے میں آسانی ہوگی، لیکن نہ تو دینداری بڑھی اور نہ ہی اسلام کے ابواب وا ہوئے بلکہ کسی حد تک مدارس کے الحاق سے یہاں کی روایات متاثر ہوئیں ایک فارغ مدرسہ تو مہریں لگا کر اسناد فروخت کرنے لگے، الحاق سے قبل یہاں ہر مہ و کہہ روایات علی گڑھ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، اب یونیورسٹی مختلف مسالک کی زد میں ہے، یہاں علاقائیت ضرور تھی لیکن یہ علاقائیت طرح طرح کی ٹوپیوں سے بہت دور تھی، علاقائیت اتنی خطرناک نہیں ہے جتنی کہ مسلکیت۔ پہلے تمام حضرات کو ائمہ مساجد کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی تردد نہ تھا۔ آج ہمارے بہت سے طلبہ کو ان ائمہ کے پیچھے نماز پڑھتے میں اعتراض ہے، وہ نمازیں اپنے کمروں میں اور نماز جمعہ کیمپس سے باہر ادا کرتے ہیں۔ حامد صاحب کی نیت صاف تھی، وہ یونیورسٹی اور مدارس کو قریب لانا چاہتے تھے۔ لیکن اس قربت نے یہاں کی روایات کو پاش پاش کیا۔ سید صاحب پاک طینت اور صالح طبیعت کے حامل تھے۔ وہ ملت کے مختلف فرقوں کو جوڑنا اور عقد اخوت میں باندھنا چاہتے تھے لیکن یہ قوم کہاں سننے والی ہے۔

سب کے الگ الگ راگ اور الگ الگ رنگ ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی یہی درخواست کی تھی کہ اپنے اپنے تشخصات کو چھوڑ کر ملت میں گم ہوجا۔ جب ہمیں سنت رسول ﷺ کا پاس نہیں ہے تو یہ علامہ اقبال اور سید حامد چہ معنی دارد۔

سید حامد کو سرسید ثانی کہنا ہرگز مبالغہ نہیں ہے، انہوں نے ہی برسہابرس سے بند تہذیب الاخلاق کو دوبارہ جاری کیا اور خود مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر مضامین تحریر کئے، اگر آپ کے سامنے سرسید کے تہذیب الاخلاق ہوں تو اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کے عادات اطوار، نظریہ تعلیم، جدید علوم وفنون، علماء کرام اور نصاب مدارس پر چھوٹے چھوٹے مضامین لکھتے تھے، اندازاتنا مؤثر اور دلنشیں ہوتا کہ پڑھتے ہی قاری دل دے بیٹھے، یہی وجہ ہے کہ تہذیب الاخلاق نے بہت سے مخالفین کو سرسید کا ہمنوا بنا دیا، بالکل اسی طرز پر سید حامد نے مضامین کے ڈھیر لگا دیے، ان میں ایسا درد، ایسی تاثیر اور ایسی دعوتِ بلیغ ہوتی کہ قارئین سید حامد کی ہم نوائی شروع کردیتے، وہ ملت اسلامیہ ہند کو باغ وبہار کی مانند دیکھنا چاہتے تھے، وہ ہر میدان میں ملت کے تفوق وتفضّل کے خواہاں تھے۔ اس میں کلام نہیں کہ انہوں نے اپنے معاشرتی اور اصلاحی مضامین کے ذریعہ ایک نہج دیا کہ کن کن مسائل پر سوچنے کی ضرورت ہے اور پھر اپنی سوچ کو کس لہجے میں پیش کرنے کا تقاضہ ہے۔ سید حامد لمحہ لمحہ قوم کے غم میں پگھلتے رہے اور اسے ادبار سے نکالنے کے لئے جتن درجتن کرتے رہے، مندرجہ ذیل اقتباس سے ان کے اندرونی الاؤ اور باطنی اضطراب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''بعض ہمدرد مشورہ دیتے ہیں کہ مسلمان اردو میڈیم اسکول نہ چلائیں اور اپنے بچوں کو عام اسکولوں میں بھیجیں پھر ان کی زبان کا کیا ہوگا، یوپی میں اب کتنے طالب علم رہ گئے ہیں جو اردو جانتے ہیں، یہ بات سرآنکھوں پر کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے صرف مسلمانوں کی نہیں لیکن اس دلنواز بات کو نچوڑ یئے تو کیا ملا؟ یہ وعدہ تو نہیں ملا کہ اردو ملک کی زبان ہے تو ملک خود اس کی حفاظت کرے گا اور اسے فروغ دے گا، ملک تو دراصل اس کے برعکس کررہا ہے۔ مسلمان بھی اس کی حفاظت نہیں کر پارہے ہیں۔ وہ تو شکایتوں کا دفتر کھول دیتے ہیں۔ عرضیاں گزارتے ہیں۔ سائل کی حیثیت سے سرکار کی خدمت میں جاتے ہیں ذاکر صاحب نے اردو والوں کو محضروں اور عرض داشتوں کا راستہ دکھایا۔ وہ ابھی تک اس راستے پر چلے جارہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اردو کی ابتدائی تعلیم کا انتظام خود گھر اور محلّہ میں کرتے۔ جس کو عمل کا حوصلہ نہیں ہوتا وہ فریاد کرتا ہے، عرضی گزارتا ہے۔ ٹھوکریں کھاتا ہے۔'' (تہذیب الاخلاق، یکم دسمبر ۱۹۸۶ء، ۵/۲۳-۲۴ص ۱۰)

سید حامد ہندوستان کے چند سلیقہ مند ارباب علم وفن میں سے تھے، بڑے نستعلیق، آداب مجلس اور آداب تکلم ان کا طرہ امتیاز تھا، باتیں کرتے تو شکرریز تبسم چہرے پر کروٹیں لینے لگتا، دل چاہتا ہے کہ شبلی کی طرح ان کا نوحہ کیا جائے، شبلی نے اپنے بھائی مولوی محمد اسحٰق کا مرثیہ کہہ کر تاریخ میں ہمیشہ کے لئے امر کردیا ہے۔ لیکن میں کہاں شاعر کہ شاعری کو اپنے جذبات کے اظہار کے لئے ذریعہ بناؤں اور نہ ہی ایسا نثر نگار کہ اپنے رنج وغم کی حقیقی عکاسی کرسکوں۔ بہرنوع سید حامد ایک بڑے انسان اور ممتاز علیگ تھے۔ اپنے اس امتیاز پر انہیں ہمیشہ ناز رہا اور اپنی مادر علمی کا ہر پل خیال رہا۔ انہوں نے اسے ملت اسلامیہ ہند کا اثاثہ قرار دیا ہے اور تحفظ اثاثہ کے لئے خود پا

برکاب رہے اور اراکین ملت سے اس کے تحفظ کے لئے ہمیشہ درخواست گزار رہے، سید حامد کا ایک قیمتی اثاثہ ان کا کتب خانہ تھا جو انہوں نے مادر علمی کے سپرد کر دیا، خاکسار نے دیکھا تو دل کہنے لگا یہ سید حامد کتابوں کا کتنا شیدائی تھا، زندگی بھر ملازمت کے جھمیلے رہے لیکن انہیں جھمیلوں میں پڑھنے اور لکھنے کا وقت نکال لیتے۔ میرا اندازہ ہے کہ پانچ ہزار صفحات انہوں نے سیاہ کئے ہوں گے اور یہ سب چیزیں ان کی قد آور ہیں، آج کا مصنف کتابوں سے کتاب بناتا ہے، یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرنٹ کا سہارا لیتے ہیں اور ہمارے اساتذہ صرف پوائنٹس بنانے کے لئے قلم سنبھالتے ہیں، لیکن ان تمام چیزوں سے سید حامد بالاتر تھے۔ اس میں اسلامیات، فارسی، اردو اور انگریزی ادبیات کا ایک معیاری ذخیرہ ہے۔ بالخصوص شعری مجموعوں کا ایک ڈھیر ہے۔ ادب و شعر ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ ادب ہر جگہ کام آتا ہے۔ مصلح اگر ادیب ہے تو اس کی باتیں حسین و جمیل ہوں گی اور دلوں میں گھر کر جائیں گی۔

سید حامد کی تحریروں کو تین خانوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے، (۱) ملی مسائل، (۲) تعلیمی نظریات، (۳) علی گڑھ تحریک۔ تینوں موضوعات پر ان کے خیالات بھرپور ہیں۔ ملت کے مختلف پہلوؤں پر بڑے پرسوز انداز میں اظہار خیال کرتے۔ تعلیمی نظریات کو بھی بڑے شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتے۔ اس میں دو باتیں ان کے پیش نظر تھیں، ایک سول سروسز میں میں ملت کے نونہالوں کو کامیاب و کامران دیکھنے کی تمنا، دوسرے طلباء مدارس کو سائنس پڑھوانا چاہتے تھے، کیوں کہ سائنس کے بغیر اس صنعتی عہد میں جینا اور دیگر قوموں کے شانہ بشانہ چلنا محال ہے۔ اس طرح کے مضامین میں سید حامد نے بار بار کہا ہے کہ سائنس ہمارے لئے کوئی شئی عجیب نہیں۔ سائنس ملت اسلامیہ کی میراث ہے، یورپ کی تمام سائنسی ترقیات کی بنیادوں میں ہم ہیں۔ مسلم سائنس دانوں کے کارناموں سے تاریخ جگمگا رہی ہے۔ خود قرآن کریم سائنس کا حامی ہے۔ لوگوں کو سائنسی طریقے سے اپنی طرف بلاتا ہے۔ اپنے اس کاز کے لئے سید صاحب نے (پروفیسر اسرار احمد کا نام انتخاب کیا چنانچہ پروفیسر صاحب نے مرکز فروغ سائنس اور تہذیب الاخلاق کے ذریعہ اس میدان میں بڑی کامیابی حاصل کی، اس کی ذریعہ سے مدارس میں سائنسی نصاب کا آغاز ہوا۔ یقیناً سید حامد صاحب کی یہ ایک بڑی کامیابی ہے۔

سید حامد کی تحریروں میں سب سے نمایاں پہلو علی گڑھ تحریک ہے۔ بیشمار مضامین میں یونیورسٹی کے طلبہ سے مخاطب ہیں کہ وہ یہاں کس لئے آئے ہیں۔ یہاں سے کیا بن کر نکلنا چاہتے ہیں۔ ملازمین کے سامنے ادارۂ سرسید کی اہمیت و افادیت کو واضح کیا اور ان سے اخلاص، دیانت اور جفاکشی کا مطالبہ کیا۔ اساتذہ کرام کے تئیں سید صاحب ہمیشہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اساتذہ کا اساسی کردار ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کا تمام تر انتظام و انصرام صرف اساتذہ اور طلبہ کے لئے ہوتا ہے۔ اساتذہ کرام اگر اہل اور جہاں دیدہ ہوں گے تو طلبہ کے اندر وہ آفاقیت پھونک سکیں گے۔ وہ انہیں ملک و ملت کے لئے بطور دستہ تیار کر سکیں گے۔ اسی لئے ان کی مستقل یہ رٹ رہی کہ اگر نا اہل استاذ کا تقرر ہو گیا تو وہ تیس سال تک کم از کم نونہالانِ ملت کی قسمت برباد کرتا رہے گا۔ سید حامد صاحب نے ہر طرح کی کوشش کی کہ تدریس کو بہتر سے بنایا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے یہ

پابندی بھی عائد کی کہ وہ اساتذہ جو مستقل حصولِ زر کے لئے باہر پڑے ہوئے ہیں انہیں بلا یا جائے۔ اور ان کے باہر جانے کا کوئی قانون بنایا جائے۔ چنانچہ جو اساتذہ کرام سالہا سال سے باہر پڑے ہوئے تھے انہیں بلایا گیا۔ بہت سے اساتذہ کرام کو نہ سننے پر اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا، آپ کے دو تاریخی فیصلے کبھی بھی فراموش نہیں کئے جا سکتے، ایک تو صدور شعبہ جات کی دوامی حیثیت کا خاتمہ، حامد صاحب سے قبل صدر محترم کو حق مداومت حاصل تھا، سیاہ وسفید کے مالک ہوتے، لوگوں کی قسمتیں ان کی مٹھیوں میں ہوتیں، ان میں سے کوئی فرعون کوئی ہامان اور کوئی شداد ہوتا۔ پرندے انہی کے حکموں سے پر ماتے، سید حامد نے اس جاگیردارانہ وزمین دارانہ نظام پر ایسی تیشہ زنی کی کہ برسہا برس کا یہ Faeedl System پاش پاش ہوا، پستی ہوئی انسانیت جمہوریت کی نعمت سے سرفراز ہوئی اور اب صدارت Rotate کرنے لگی، لیکن اس Rotation میں بہت سے ایسے نااہل بھی صدارت کے مستحق بن بیٹھے جن کے بارے میں قرآن کریم نے اس طرح تصویر کشی کی ہے: "والبلد الطيب يخدع نباته باذن ربه والذى خبث لا يخدع الا نكدا، (الأعراف: ۵۸:۷) اور زرخیز زمین کی پیداوار تو خواب اپجتی ہے اس کے رب کے حکم سے جو زمین ناقص ہوتی ہے اس کی پیداوار کم ہی ہوتی ہے۔

دوسرا اہم اقدام یہ رہا کہ تاریخ پیدائش کے متعلق عہد سیدی میں یہ طے پایا کہ ہائی اسکول یا اس کے مساوی ڈگری میں جو تاریخ پیدائش ہو وہی قابل تسلیم ہوگی اس سے قبل جو چاہا اور جس طرح چاہا تاریخ پیدائش داخل کر دی اور یونیورسٹی سے منوالیا لیکن حامد صاحب نے اس پر قدغن لگائی اور بہتوں کو سبکدوشی کا راستہ دیکھنا پڑا۔ سید صاحب نئے نئے آئے تھے، انہوں نے ایس ایس ہال کا دورہ کیا۔ ایک مالی صاحب جو پیران پیر ہو چکے تھے۔ دوڑے دوڑے حامد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ خادم نے اپنے ہاتھوں سے آپ کو پانی پلایا ہے۔ حامد صاحب کا ماتھا ٹھنکا کہ مجھے پانی پلانے والے یہ صاحب ابھی تک یونیورسٹی کی خدمت کئے جا رہے ہیں۔ حساب سے تو یہ بزرگ کب کے ساٹھ پار کر چکے ہیں۔ چنانچہ چند ہی روز میں انہیں نامۂ استراحت مل گیا۔ غالباً ہمیں معلوم نہیں کہ طلب مادیت میں اگر ہم نے تاریخ پیدائش کچھ سے کچھ دکھایا اور لاکھوں روپے حکومت سے لیتے رہے تو یہ تمام آمدنی سراسر حرام ہے اور اس پر عنداللہ مواخذہ ہے۔ آج کے اس مادی دور میں پروفیسر وسیم احمد قابل اتباع ہیں جنہوں نے ڈھائی سال قبل ریٹائرمنٹ لے لیا کیوں کہ تاریخ پیدائش کے حساب سے ان کی ڈھائی سال عمر کم درج تھی۔ خدا کرے یہ مثالی نمونہ ہمارے لیے قابل عمل ہو اور ہم اپنی عمروں کے باب میں صداقت کا ثبوت دیں، خدا کرے کہ کوئی اٹھے جو حامد صاحب کے اس طرح کے کارناموں کو Documented کرے۔ اس میں کیا کلام کہ حیات سید حامد کھلی کتاب کی مانند ہے۔ لاریب یہ کھلی کتاب آئندہ آنے والے شیوخ الجامعہ کے لئے ایک لائحہ عمل ہے جسے اپنانے سے یونیورسٹی کی تقدیر بدل جائے گی۔

بہرکیف یہ اقدامات یونیوسٹی طلبہ کے حق میں انتہائی بہتر تھے۔ اس کی وجہ سے تدریس کا خوشگوار ماحول پیدا ہوا، یہ سب کچھ سید صاحب اس لئے کر رہے تھے کہ انہیں اپنی مادر علمی، سر

سیداورملت سے غیر معمولی تعلق تھا۔اوراس کے لئے ہرسیلاب بلا سے گزرنے کو تیار رہتے ایک بار تو بم تک کا سامنا کرنا پڑا لیکن اللہ نے انہیں ایسا پرعزم، مستقل مزاج اور صاحب بصیرت بنایا تھا کہ طوفان نوح سے گزرنا بھی ان کے لئے آسان تھا۔طلبہ احتجاج پراحتجاج کررہے تھے، ہرطرف انارکی اور بغاوت کا بگل بجا ہوا تھا، مرحوم آفتاب کی شہادت نے مسئلے کوانتہائی سنگین بنادیا تھا۔ پھر بھی ان کے عزم صمیم اور حکومت ہندکی معاونت نے انہیں سنبھالا دیا اور یونیورسٹی کو Track پر لاکرچھوڑا جس کا مرحوم سید ہاشم اختر اکثر اپنی تقاریر میں ذکر کیا کرتے تھے، یہاں ایک اقتباس نقل کیا جارہا ہے جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ مادردرسگاہ کے باب میں کن جذبات واحساسات کے حامل تھے۔

’’ہماراسب سے بڑاادارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ حکومت کی گرفت نہ ہوتو خانہ جنگی اس کے ٹکڑے کردے، اس ریگ زار میں کئی نخلستان ہیں جہاں تحقیق اور معیار پروان چڑھ رہے ہیں، نخلستانوں سے نکلئے تو ہرطرف ریت ہی ریت، بے حسی، خودغرضی جہالت، کاہلی، غیبت اور بے عملی کی ریت، یونیورسٹی کے اسکول کی عمارت پر نظر ڈالے، ہندوستان بھر میں گنتی کے دو چار ہائی اسکول ہوں گے جن کو اتنی وسیع اور باترتیب، کشادہ اور خوبصورت اور موزوں عمارت ملی ہو، اساتذہ اچھی تنخواہیں پاتے ہیں۔ پاس ہی یونیورسٹی کے استاد ہیں، محل وقوع اور وحدت اہتمام کو اس کا ضامن ہونا چاہیے کہ یونیورسٹی کی فیکلٹی اپنی اس نرسری کی دیکھ بھال کرتی، یونیورسٹی کے اسکول (جس کا نام نہ معلوم کیوں ایس ٹی ہائی اسکول رکھ دیا گیا) کے طالب علم بیرونی طالب علموں سے بہت زیادہ قابل ہونا چاہیے تھے، حال یہ ہے کہ ان کے ساتھ اگر داخلوں میں تمدن کی بہت بڑی رعایت نہ کی جائے تو یونیورسٹی میں انہیں داخلہ ہی نہ ملے، یونیورسٹی کے معیار گرانے کی ذمہ داری خود یونیورسٹی کے اسکولوں پر (اس کے استادوں کے علاوہ) عاید ہوتی ہے‘‘ (تہذیب الاخلاق یکم تا۱۲اکتوبر۱۹۸۶ء/۱۹/۵/۲۰۰۱،ص۱۵)

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے سید حامد مختلف الجہات انسان تھے، قابل ستائش منتظم ومنصرم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحب طرز ادیب اور قابل فہم ناقد تھے، اہل اردو ادب ان کی ادبی اور تنقیدی فتوحات کا ہرروز جائزہ لیں گے۔ وہ ایک تخلیقی ذہن کے حامل تھے ان کی تحریریں شاہد ہیں کہ وہ نئے نئے الفاظ، تراکیب اور تعبیرات استعمال کرتے تھے، مبدأ فیاض نے انہیں لسانی اسرارورموز سے نوازا تھا۔ سید صاحب کی تحریروں کا اس حیثیت سے مطالعہ کرنا افادیت بخش ہوگا۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ ان کی ادبی حیثیت کے تعین میں فارسی دانی کی شرط لازمی ہے، آج کا معمولی محقق ان کی حقیقی ادبی عظمت کا پتہ لگانے سے قاصر ہوگا۔ ان کی تحریروں میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ سید صاحب کے ادبی مضامین اور تصنیف نگارخانہ رقصاں کی روشنی میں اعتماد کے ساتھ اس رائے کا اظہار کیا جاسکتا ہے کہ قدیم اردو ادب اور شاعری کا گہرائی سے انہوں نے مطالعہ کیا تھا۔ یہاں ایک اقتباس سے ان کے ادبی عمق کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

غالب کی اردو اور فارسی غزلوں میں بہت سی مشابہتوں سے قطع نظر ایک بڑا فرق یہ ہے کہ اردو کی غزلیں بظاہر سکون اور عافیت کے ساتھ فراغت میں کہی گئی ہیں، ان میں کشادگی،

فرحت اثری اور شگفتگی ہے، یہاں شاعر تنہا تھا اور جانتا تھا کہ اس کی اردو غزلیں نام نہاد ''بے رنگی'' کے باوصف اردو کی شاعری میں عدیم المثال ہیں، سودا کی غزلوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی، خدائے سخن میر کا اسلوب الگ ہی تھا جہاں مضمون آفرینی، موشگافی اور بلند پروازی کے مواقع نسبتاً کم تھے اور ان کی طرف اس نابغۂ روزگار کا دھیان بھی نہ تھا۔ معاصرین میں مومن خاں کے یہاں نازک خیال لفظ گوئی اور ندرت آرائی اور طباعی ملتی ہیں، لیکن ان کے یہاں بھی ایسے اشعار کم ہیں جن میں جذبہ فکر اور اظہار باہم مل کر استعاراتی انداز کے سایہ میں تخلیق جہاں کے لئے مامور ہو گئے ہوں۔ ذوق کو قصیدہ سے الگ کر لیجئے تو وہ کسی شمار و قطار میں نہیں تھے، چنانچہ قیاس یہ کہتا ہے کہ اردو غزل کہتے ہوئے غالب کو شاید کبھی یہ خیال نہ ہوا ہو کہ کوئی ان کا حریف یا اسالیب بیان میں ان کا شریک ہے۔ فارسی غزل کی بات الگ ہے۔ یہاں عصر سے قطعِ نظر، غالب کے گرد و پیش زمانی، مذہبی، شعری قرب کی وجہ سے عرفی، نظیری، ظہوری، صائب، طالب، کلیم، حزیں، بیدل تھے۔ غالب نے اپنی فارسی غزلیں بالعموم حریفانہ انداز میں کہی ہیں، اس تناؤ کی کیفیت میں جس سے کھلاڑی اہم میچ یا مقابلہ سے بہت پہلے سے گزرنے لگتا ہے، جس کا تجربہ امتحان یا انٹریو کی شام کو ہر اچھا سنجیدہ امیدوار کرتا ہے اور جو گھوڑ دوڑ سے پہلے سمندر کے رگ و پے اور اس کے ہر بن سو سے شدت ارتکاز کی شکل میں ٹپکنے لگتی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ غالب کی فارسی غزلوں میں بسا اوقات اردو غزلوں سے زیادہ معنویت، سمٹاؤ، ایجاز، تہ داری، مضمون آفرینی اور دروبست ہے لیکن ان میں بصیرتیں اور تحیر آفرینیاں، عقدہ کشائیاں، عادت شکنیاں، رہنمائیاں اور شگفتگیاں، اردو غزل کے مقابلے میں کم دستیاب ہیں، نہ وہ زیر لب تبسم جو دنیا کو بہ حیثیت ایک بازیچہ اطفال کے دیکھتے ہوئے شاعر کے نہاں خانۂ دل کو منور کر دیتا ہے۔ (فکر و نظر اے ایم یو علی گڑھ ۱۹۹۱، ۲۸/اص، ۵-۳۰، ۲/۲۸، ۵-۳۵)

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں سید حامد کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ یہ مضمون دو قسطوں میں ''غالب کی فارسی غزل'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں غالب کی اردو اور فارسی غزلیات کا تنقیدی محاکمہ و موازنہ ہے۔ یقیناً مباحث مضمون سے مترشح ہے کہ سید حامد صاحب نے غالب کا بڑے توقف و تدبر سے مطالعہ کیا تھا، اس میں یہ بھی بتایا گیا کہ مطالعۂ غالب کا کیا انداز ہو، یقیناً غالب پر رقم کردہ مضامین میں اسے ضرور اولیت دی جائے گی۔ مجھے امید ہے کہ اربابِ اردو ادب سید حامد کے انتقاد کو ضرور موضوع بحث بنائیں گے۔

سید حامد کی نثر نے جس طرح بہتوں کو اپنے سوز دروں کا احساس دلایا ہے اور اپنے قدردانوں کا ایک وسیع حلقہ بنایا ہے، اسی طرح ان کی شاعری نے بھی اپنی ایک شناخت بنائی۔ ان کی بیورو کریسی انہیں جہاں جہاں لے گئی وہاں وہاں ان کی ادبی اور شعری کاوشیں کارفرما رہیں، لکھنو میں حافظ سید صدیق حسن آئی سی ایس کی (وضاحت کے لئے دیکھئے: پرانے چراغ مولانا ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ فردوس، لکھنو، بادل اول، ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵م، ص ۲۸۵-۲۹۵۔) کی ادبی مجلسوں میں انہیں اپنی ادبی فتوحات کو پیش کرنے کے مواقع ملے۔ الہ آباد میں شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ نے ان کی ادبی منزلت کا اعتراف کیا۔ ملازمتی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ بالمداومت ادبی

تراش خراش جاری رہی۔ یہی ہلکا پھلکا تراش وخراش ان کے عظیم ادبی کارناموں کا پیش خیمہ بن گئی، شعراء بلندشہر، قوس و قزح اور گلدستہ ان کی ابتدائی کاوشیں ہیں۔ شعراء بلندشہر کے سوانح حیات اور نمونہ کلام بڑی دقتوں سے جمع کئے گئے ہیں، اس میں بہت سے غیر معروف شعراء کے کوائف اگر قلم بند نہ کئے جاتے تو وہ تاریخ کا حصہ بننے سے رہ جاتے۔ حامد صاحب کی یہ کتاب اولین مصدر کی حیثیت رکھتی ہے اور بلندشہر کی ایک مستند شہری تاریخ بتاتی ہے۔ یہاں تو ہم ان کے چند اشعار کے توسط سے ان کے شعری حسیات کو منظرم عام پر لانا چاہتے ہیں۔ حامد صاحب روایتی اقدار کے حامل تھے، انہی روایات میں اچھے شعر کہے جاتے ہیں، حالات کے ساتھ ساتھ شعراء کے ڈکشن اور کینوس میں تغیر ضروری ہے۔ شاعر اپنے ماحول اور اپنے لوگوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ لب و لہجے اور ترسیل وتبلیغ میں تبدل کے بغیر ترجمانی ممکن نہیں۔ لیکن یہ بھی طے ہے کہ روایاتی اقدار کے بغیر شاعری میں مہک اور کشش کا پیدا ہونا محال ہے۔ حامد صاحب روایتی اسالیب کے ساتھ نئے اقدار کا سامنا کرتے تھے، پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے ان کی شاعری کا دیانت دارانہ جائزہ لیا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے چند اشعار نقل کئے جارہے ہیں:

پاس تھا دل، تو کوئی ذکر نہ تھا　　کھو گیا ہے تو جا بجا ہوگا
فتنہ سامانی جراحت، خلفشار　　آپ کالی ہاتھ کیوں آنے لگے
ان کی محفل میں ہوا جو باریاب　　اس کو سارے شیر وبرانے لگے
گردسے دامن تو جھاڑ ادشت کی　　ساتھ میں دو چار دیوانے لگے
آپ آئیں تو آنکھ میں آجائے　　دم ابھی اتنا جانِ زار میں ہے
آپ کے لطف پر ہے اتراتا　　ورنہ حامد کسی شمار میں ہے
کوئی وعدہ نہیں کوئی پھر بھی　　آج تک ان کے انتظار میں ہے
دیر تک سامعہ نے پھول چنے　　تم نے ایک لمحہ گل فشانی کی
ناصیہ پر جو آگئی ہے شکن　　اوٹ ہے پرستش نہانی کی

سید حامد کی جہاں دیدگی اور دانشوری کے سلاسل بڑے وسیع وعریض ہیں، ایک زمانہ تھا کہ ان کے مخالفین کا جم غفیر تھا۔ حالات گذرتے گئے، ان کے اخلاص کی دنیائے بسیط دھیرے دھیرے نظروں کے سامنے آگئی اور اب شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ان کا مخالف ومعاند ہو اب وہ ہمارے قائد، محبوب ومرغوب اور دلوں کی دھڑکن ہیں۔ ۲۹ دسمبر ۲۰۱۴ء کو سوا پانچ بجے شام یہ آفتاب نصف غروب کیا ہوا کہ ایک عالم کو سوگوار کر گیا، گویا یہ سال جاتے جاتے ایسا غم دے گیا کہ جس سے نکلنا آسان نہیں اس داغ مفارقت نے امت کے کی چولیں ہلا دیں، بس

مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ تجھے

مادر درسگاہ پر یہ خبر بجلی بن کر گری، شیخ الجامعہ کی صدارت میں ۳۰ دسمبر کو تعزیتی نشست کا اہتمام کیا گیا، پروفیسر پرویز طالب اور محترم ڈاکٹر شارق عقیل نے پرنم آنکھوں سے ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ دونوں تقاریر سلیقہ اور اپنے سردار سے عقیدت وحمیت کا اظہار ہو رہا تھا، سردار چلا گیا۔ اب ہماری سچی خراجِ عقیدت یہ ہے کہ ان کی ملی منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے میں اخلاص کا ثبوت دیں۔ ڈاکٹر شارق عقیل نے اس آفتاب عالم تاب کے آسودہ خاک ہونے کا ذکر اس طرح کیا:

ٹوٹ کر سورج گرا کرنیں پریشاں ہو گئیں
دفن اک لمحے میں جانے کتنی صدیاں ہوگئیں
(احسان دانش)

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نام کتاب: المحدث الکبیر العلامہ محمد زکریا الکاندھلوی وجھودہ فی السنۃ والنبویۃ

مصنف: ڈاکٹر محمد اشرف علی الندوی الازہری

صفحات: ۴۸۸ **قیمت:** ۶۰۰

ناشر: موسسۃ الحرم لاحیاء التراث الاسلامی لکھنؤ

ملنے کے پتے: مکتبہ ندویہ، مکتبہ شباب، مکتبہ احسان لکھنو، مکتبہ یحیی سہارنپور، مکتبہ الحرم احمد آباد۔

کتاب کے نام سے ہی قارئین اس کی ضخامت و قیمت کا اندازہ کر چکے ہوں گے، بیسویں صدی میں ہندوستان کے جن علماء نے علوم حدیث کی خدمت کی ہے ان میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کا نام بہت نمایاں بلکہ سر فہرست ہے۔

زیر نظر کتاب دراصل ڈاکٹر اشرف شعبان ندوی صاحب کی Ph.D کا فاضلانہ مقالہ ہے، ان کے اس مقالہ پر جامع ازہر سے ان کو ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی گئی، مصنف کتاب اس قیمتی مقالہ کے لئے جس قدر مبارکباد کے مستحق ہیں اسی قدر موسسۃ الحرم کے بانی اور اس کتاب کے ناشر ندوۃ العلماء کے نائب مہتمم مولانا عبدالقادر صاحب ندوی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے قارئین کو اپنی محنت ولگن سے یہ قیمتی وعلمی تحفہ عطا کیا، یہ کتاب اب تک حضرت شیخ سے متعلق منظر عام پر آنے والی کتابوں میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں حضرت شیخ کے زمانے اور ان کے حالات زندگی کو قلم بند کیا گیا ہے، دوسرے باب میں ان کی خدمات حدیث کا احاطہ کرنے کی خوبصورت کوشش کی گئی ہے، ان کے فاضل اور نامور تلامذہ کا ذکر کرکے شیخ کے فن تدریس کی مہارت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان کی مطبوع ومخطوط تالیفات کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، تیسرے باب میں شیخ کی دعوتی واصلاحی کوششوں کو بیان کیا گیا ہے، ان کے علمی آثار کے تذکرے کے ساتھ دعوتی اسفار کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اس باب کو قدرے تفصیل سے لکھ کر مصنف نے شیخ کی جملہ علمی، ادبی، اصلاحی وتربیتی کوششوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ انتہائی شفاف عربی زبان میں مصنف نے اچھا علمی ذخیرہ ایک جلد میں جمع کیا ہے، غالبا طوالت سے بچتے ہوئے اس علمی

بحث میں یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ عناوین زیادہ ہیں اور ان پر مواد کم، موسوعاتی طرز پر معلومات فراہم کرنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی گئی ہے البتہ جس درجہ کی یہ علمی بحث ہے اس درجہ کا تجزیاتی مطالعہ اس میں نظر نہیں آتا، اگر تجزیاتی نظر سے ہٹ کر صرف موسوعاتی طرز سے اس کا مطالعہ کیا جائے تو یہ کتاب اپنے قاری کو آسان زبان میں حضرت شیخ کی زندگی اور ان کی خدمات، ان کے عہد اور ان کے جملہ حالات کے متعلق وافر معلومات فراہم کرتی ہے۔

کتاب کے عنوان سے اس کا دوسرا جزء ''وجهوده فی السنة النبوية'' معلوم ہوتا ہے، راقم کی ناقص رائے میں اگر اس حصہ میں تجزیاتی مطالعہ کے ساتھ شیخ کی خدمات کا تقابلی مطالعہ کی مدد سے مقام ومرتبہ بھی متعین کیا جاتا تو کتاب میں چار چاند لگ جاتے، اگر چہ یہ آہنگ موجود ہے مگر جس قدر ہے وہ اضافہ کا طالب ہے۔

بہر حال یہ کتاب طبقۂ علماء کی توجہ چاہتی ہے، مدارس اسلامیہ کے طلبہ اور علمی اشتغال رکھنے والوں کے لئے یقیناً ایک مرجع کا کام دے سکتی ہے، اس کے مصنف نے بڑی عرق ریزی کے بعد سینکڑوں مصادر و مراجع اور نصوص کا مطالعہ کر کے یہ ضخیم کتاب علمی دنیا کو ایک علمی تحفہ کے طور پر دی ہے، نئی نسل کے لئے یہ کتاب ایک آئیڈیل ثابت ہوسکتی ہے، بالخصوص جو لوگ بڑے مدارس میں ہیں کہ اس طرح کے علمی کام وہ اپنی حدود میں رہتے ہوئے کر سکتے ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ اس ضخیم موسوعاتی کتاب کا علمی دنیا میں اس کے شایان شان استقبال کیا جائے گا اور اس طرح اس کے مصنف وناشر کی گراں قدر خدمت کا کچھ حق ادا کیا جائے گا۔

نام کتاب: تفسیری خطبات (اول

مصنف: مولانا محمد ساجد حسن صاحب

ناشر: مکتبہ تفسیر القرآن نزد مظاہر العلوم

صفحات: ۲۸۰ **قیمت:** (درج نہیں)

ملنے کے پتے: دیوبند، سہارنپور، دہلی کے سبھی مشہور کتب خانے

زیر نظر کتاب مظاہر العلوم کے معروف استاد مولانا محمد ساجد حسن خاں صاحب کے علم ومطالعہ کا نفع بخش اور عام فہم نتیجہ ہے جو انہوں نے احیائے دین اور اصلاح معاشرہ کی ایک کوشش کے طور پر انجام دینے کی کامیاب کوشش کی ہے، یہ کتاب ۲۵ موضوعات پر انتہائی سادہ وعام فہم اسلوب میں پیش کیے گئے خطبات پر مشتمل ہے، معاشرے کی تعمیر اور کردار کی تشکیل میں جو موضوعات انتہائی اہمیت کے حامل ہیں وہ اس کتاب کا حصہ ہیں، بہت اچھی بات یہ ہے کہ اس کے ذریعہ قرآن کی تعلیمات اور پھر حدیث کے ذریعہ ان کی تشریح سے قاری کو نہ صرف دین سمجھنے بلکہ قرآن سے بھی قریب ہونے کا موقع ملے گا۔

اس میں مصنف نے یہ منہج اختیار کیا ہے کہ پہلے موضوع سے متعلق قرآن کی آیت ذکر کرتے ہیں، پھر اس کی تشریح کرتے ہیں اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں موضوع کے تمام متعلقات کو انتہائی آسان زبان اور بہت واضح اسلوب میں بیان کرتے ہیں، خدا کرے کہ اس کی بقیہ جلدیں بھی آتی رہیں اور اصلاح نفس واصلاح معاشرہ کے لئے یہ کامیاب

کوشش جاری رہے۔

کتاب کی طباعت کو اگر تھوڑا سا معیاری کر دیا جائے تو بہت بہتر ہوگا، ایک طرف تو اردو کی کتابیں اس پر مستزاد اردو کی مذہبی کتابیں خریدنے میں جس قدر لوگ بے اعتنائی برت رہے ہیں اسی قدر ہماری طباعت کا معیار گرتا جا رہا ہے، جس کے کئی نقصانات ہیں لیکن یہ ان کے ذکر کا موقع نہیں، عرض صرف یہ کرنا ہے کہ طباعت بہت عمدہ نہیں تو معیاری ضرور ہونی چاہیے، بہر حال اس صورت میں بھی قارئین کے لئے یہ یک گراں قدر تحفۂ زندگی ہے، وہ اسے خرید کر خود بھی مستفید ہو سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی ترغیب دے سکتے ہیں۔

مصنف محترم سے دو درخواست ہیں ایک تو یہ کہ ہر موضوع کے متعلق جس طرح وہ متعدد احادیث نقل کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ آیت کریمہ کی تشریح کرتے ہیں اسی طرح ہر موضوع کے متعلق جو بھی آیات قرآن میں وارد ہوئی ہیں ان کو ذکر کر دیا کریں تو اس طرح آیت کی تشریح میں پہلے آیات آجائیں گی اور پھر احادیث سے وضاحت ہوجائے گی اور قاری کا نفع دوہرا ہو جائے گا، اور آیات قرآنیہ کے زیادہ سے زیادہ معانی و مفاہیم سے وہ متعارف ہوجائے گا۔

دوسری بات یہ کہ اس دراز سلسلہ کو ضخامت کم کر کے شائع کریں مثلاً دس- دس موضوعات (جن میں آپس میں تعلق ہو) ایک جلد میں شائع کریں تو انشاء اللہ یہ مزید نفع عام کا ذریعہ ہوگا، اور لوگ آسانی سے خرید کر پڑھا کریں گے۔

نام کتاب:

(۱) زنداں سے تخت شاہی تک (صفحات ۵۶)

(۲) آتش عشق (صفحات:۷۲)

مصنف: عبدالعظیم معلم ندوی

ناشر: معہد امام حسن البنا شہید، بھٹکل

زیر نظر دونوں کتابیں قرآن کریم سے مستفاد ''قرآنی ناول'' ہیں، اول الذکر میں انسانی زندگی کے مختلف کرداروں کے حامل قصہ یوسف کو موضوع بنایا گیا ہے جس کو خود قرآن نے احسن القصص کہا ہے، جبکہ دوسرے ناول کا موضوع حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی حیات مبارکہ ہے، اس کا نام خود بلند ادبی ذوق کا غماز ہے، اقبال نے اسی عاشق کے متعلق کہا تھا۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

اردو میں ادب اسلامی کی تحریک کو ایک لمبی مدت ہوگئی، بارہا اس کا احساس رہتا تھا، کہ نظریہ ادب اسلامی کو تطبیق تخلیقات میں نہیں پیش کیا جاتا، قرآنی ناول کے اس سلسلہ کے تخلیق کار کے حوصلہ کو سلام جنہوں نے نظریہ کی تطبیق کا بیڑا اٹھایا اور فی الحال ان کے یہ دو مختصر ناول منظر عام پر آئے۔

اردو ادب میں ایسے ناول نہ کے برابر ہیں جن پر ہم ادب اسلامی کے نظریہ کا اطلاق کر سکیں، یہ دونوں ناول بھی فنی حیثیت سے اسی زمرے میں ہیں، اس امر کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں کہ جو لوگ اردو ادب کے گیسو سنوارنے کا ہنر رکھتے ہیں انہیں یا تو ادب اسلامی سے بیر ہے یا نیک نیتی

کے باوجود اس کے اصولوں سے خاطر خواہ واقفیت نہیں، اور جن کا ذوق پاکیزہ اور نیت خالص ہے، انہیں یا تو ادب اسلامی کو فن کی حیثیت سے پڑھنے کا موقع نہیں ملا یا پھر وہ تخلیق کی صلاحیت نہیں رکھتے، اردو میں کچھ سماجی ناول ایسے ہیں، کچھ کہانیاں اور افسانے ایسے ہیں جن کو ہم ادب اسلامی کا علمبردار کہہ سکتے ہیں، جہاں تک اسلامی تاریخ سے مستفاد ناولوں کا تعلق ہے تو ان پر بھی ادب اسلامی کا کلی طور پر انطباق نہیں کیا جا سکتا، مذکورہ بالا صورت حال میں قصور ہمارا ہے کہ ہم نے اب تک نظریہ ادب اسلامی کو بہ حیثیت ایک ادبی اسکول پیش نہیں کیا اور نظریہ وفن کی تطبیق تو دور نظریہ کی بھی واضح تشریح نہیں کی، اس سلسلہ میں ادب اسلامی کی تحریک کے عرب ارکان مبارکباد کے مستحق ہیں جنہوں نے نظریہ کی تشریح بھی کی اور فنی وتخلیقی تطبیقات سے مکتبہ ادب اسلامی کو مالا مال کر دیا۔

مذکورہ بالا دونوں کتابیں واقعی ایک خوش آئند اور حوصلہ افزا تخلیقی کوشش کا نتیجہ ہیں، لیکن راقم اس کوشش کو ابتدائی کاوش تصور کرتا ہے۔ جب اس نوجوان مصنف کا قلم ارتقائی منزلوں کو طے کرتے ہوئے چوتھا۔ پانچواں ناول پیش کرے گا تو اسمیں نظریہ وفن کی تطبیق ٹھوس ناولانہ اسلوب میں نظر آئے گی، جس طرح یہاں بھی ثانی الذکر کا اسلوب پہلے ناول کے اسلوب سے زیادہ نکھرا ہوا ہے۔

مصنف سے التماس ہے کہ وہ عرب اسلامی ناول نگاروں بالخصوص علی احمد باکثیر، نجیب کیلانی اور عبدالحمید جودہ السحار کے ناولوں کا ضرور مطالعہ کریں اور فنی حیثیت سے ان کو برتنے کی کوشش کریں جبکہ اردو زبان کے لئے ہمارے یہاں بے شمار شاہکار موجود ہیں جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، اسی طرح نظریہ ادب اسلامی کو بھی پورے طور پر سمجھ کر قلم اٹھائیں تا کہ جو چیز بھی منظر عام پر آئے وہ مثال بن جائے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر عبدالباسط بدر، عبدالرحمٰن رافت باشا اور نجیب کیلانی اور مشہور ناقد محمد حسن بریغش کی کتابیں بہت مفید ہیں، بالخصوص بریغش صاحب نے نظریہ کو فنی نمونوں کی تجزیاتی تطبیق سے سمجھانے کی اچھی کوششیں کی ہیں، راقم نے خود اسی مقصد سے ڈاکٹر مامون فریز جرار کی کتاب ''خصائص القصۃ الاسلامیۃ'' کی اردو تلخیص ''اسلامی افسانوی ادب'' کے نام سے کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک عمدہ، اچھوتی اور قابل قدر پہل ہے، لیکن ہم متمنی ہیں کہ کوئی اس میدان کا ایسا شہسوار سامنے آئے جو اردو ناول کا رخ بدل کر اسے اصلاحی اور اسلامی بنا دے، ہم جانتے ہیں کہ عبدالعظیم معلم صاحب کے ان ناولوں کا یہ رنگ دین دار حلقہ میں ضرور مقبول ہوگا، لیکن ہماری خواہش ہے کہ اس طرح کے ناول اس معیار کے ہوں کہ اردو ادب کے حلقوں میں سند وسرمۂ اعتبار بنیں اور ان کے ذریعہ وہ لوگ نہ صرف ادب اسلامی کو سمجھ سکیں بلکہ اپنی تخلیقات کا قبلہ متعین کر سکیں، امید ہے کہ قارئین ان کتابوں کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور مصنف گرامی ہمارے حقیر مشوروں پر توجہ فرمائیں گے۔

☆☆☆

آخری صفحہ

اورانہوں نے اپنی تقریر ختم کردی

(م-ق-ن)

حضرت حکیم الأمت مولانا اشرف علی تھانویؒ کانپور میں مدرس تھے، انہوں نے مدرسہ کے جلسہ کے موقع پر اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کو بھی مدعو کیا، کانپور میں بعض اہل علم معقولات (فلسفہ ومنطق) کی مہارت میں معروف تھے اور کچھ بدعات کی طرف مائل تھے۔ ادھر علماء دیوبند کی توجہ چونکہ خالص دینی علوم کی طرف رہتی تھی، اس لئے یہ حضرات یوں سمجھتے تھے کہ علماء دیوبند کو معقولات میں کوئی مہارت نہیں، حضرت تھانویؒ اس وقت جوان تھے اور ان کے دل میں حضرت شیخ الہند کو مدعو کرنے کا داعیہ ایک یہ بھی تھا کہ حضرت کی تقریر ہوگی تو کانپور کے علماء کو پتہ چلے گا کہ علماء دیوبند کا علمی مقام کیا ہے، اور وہ منقولات اور معقولات دونوں میں کیسی کامل دستگاہ اور مہارت رکھتے ہیں، چنانچہ جلسہ منعقد ہوا اور حضرت شیخ الہندؒ کی تقریر شروع ہوئی۔ حسنِ اتفاق سے تقریر کے درمیان کوئی معقولی مسئلہ زیر بحث آگیا اس وقت تک وہ علماء جن کو حضرت تھانویؒ حضرت شیخ الہند کی تقریر سنانا چاہتے تھے جلسہ میں نہیں آئے تھے، جب تک تقریر شباب پر پہنچی اور معقولی مسئلہ کا انتہائی فاضلانہ بیان ہونے لگا تو وہ علماء تشریف لائے جن کا حضرت تھانویؒ کو انتظار تھا حضرت تھانویؒ بہت خوش ہوئے لیکن ہوا یوں کہ جوں ہی حضرت شیخ الہند نے ان حضرات کو دیکھا تقریر مختصر کرکے ختم کردی اور بیٹھ گئے، حضرت فخر الحسن گنگوہیؒ موجود تھے انہوں نے یہ دیکھا تو پوچھا کہ حضرت اب تو تقریر کا اصل وقت آیا تھا آپ بیٹھ کیوں گئے؟ جواب دیا ہاں دراصل یہی خیال مجھے آگیا تھا (یعنی کہ اب تک تو تقریر خالص اللہ کے لئے ہورہی تھی، یہ خیال آنے پر کہ اب اپنا علم جمانے کے لئے ہوگی تقریر ختم کردی (تحفۃ الطلباء والعلماء صفحہ ۱۰۰)

مندرجہ بالا واقعہ کو نگاہ حقیقت سے پڑھئے اور اس واقعہ کے مالہ وماعلیہ کو آئینہ دل میں اتاریے، دل کے نہاں خانہ میں جگہ دیجئے اور پھر غور کیجئے کہ کیا کبھی ہم نے بھی اپنی تقریر اور تحریر کو محض اس جذبہ اور مقصد کے لئے روک دیا اور مختصر کردیا ہے کہ یہ تقریر اور تحریر ابھی تک تو اللہ کے لئے تھی اور اب یہ علمی رعب جمانے کے لئے ہے؟ آج تو مقررین حضرات اور خاص طور پر پیشہ ور مقررین ناظم جلسہ کو مجبور کرتے ہیں کہ ان کو اس وقت دعوت اسٹیج دی جائے جب جلسہ شباب پر ہو حاضرین میں سے تمام یا اکثریت جلسہ گاہ میں موجود ہوں اگر مقررین کی فہرست طویل ہونے کی وجہ سے ناظم جلسہ ان کے حکم کی تعمیل نہیں کرپاتے تو ناراض ہوتے ہیں اور آئندہ نہ آنے کی دھمکی دیتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ آج ہماری زیادہ تحریریں، تقریریں اور وعظ و نصیحتیں علمی رعب جمانے اور عوام الناس کو متأثر کرنے کے لئے ہوتی ہیں اخلاص وللّٰہیت کا اور خلوص وصداقت کا دور دور تک پتہ نہیں ہوتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وعظ وبیان پند ونصیحت اور تقریروں و تحریروں میں وہ اثر نہیں رہا جیسا ہونا چاہیے، شاعر نے انہیں جیسے واعظین اور مقررین کے لئے کہا تھا۔

واعظ کا ہر ارشاد بجا تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرور عشق نہیں چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

لہذا ضرورت ہے کہ ہم اپنی تحریروں اور تقریروں میں خلوص وللّٰہیت پیدا کریں ہمارا سارا کام، لکھنا، پڑھنا، وعظ کہنا، نصیحت کرنا، تحریک اور تنظیم قائم کرنا وغیرہ سب اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ہو۔ عوام الناس کو متوجہ کرنے اور اپنا علمی رعب قائم کرنے کا جذبہ اور خیال نہ ہو۔ اگر ہم نے ایسا کرلیا تو بعید نہیں کہ ہماری باتوں تحریروں اور تقریروں میں وہی روح اور تاثر پیدا ہوجائے اور لوگ کہہ اٹھیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

☆☆☆